



اقبال

انامک ادب

کتبخانه  
تاج آفس  
بند سادوڈ  
کر لہجی

PLEASE DO NOT  
CARDS OR SLIPS FROM

---

UNIVERSITY OF TORO

---

PK      Ja'fari, Ra'is A  
2199      Iqbāl  
I6Z67





Ja'fari, Ra'is Ahmad

اقبال

Iqbal

از

رئیس احمد جعفری

ناشر

شیخ نذیر احمد مالک کتب خانہ تاج سمن

محمد روضا بی بی نمبر ۳

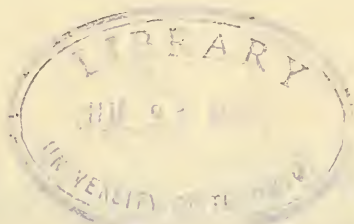
صرف ادبی نقطہ نظر سے اقبال کی شاعری  
اور

شاعری کے آب و رنگ پر سیر حاصل اور مکمل تبصرو

PK

2199

I6 Z67



853243

بخشیش لاله صبح بهارم  
 پیای پی سوزم از دایغی که دارم  
 چشمم کم بین تنه سائیم را  
 که من صد کاروان گل در کنارم

# فہرست

صفحات

## اقبال

حالات و سوانح :- سفر یورپ - وکالت کی اجازت - شادی ، شاعری  
 سیاحت میں حصہ - آمدنی - زندگی کا آخری دور  
 ۱۹ تا ۷۰ { علالت - وفات - بچہ مرگے بغیر - تکفین -

۲۰ تا ۳۱

{

## اقبال

تاثرات و مشاہدات -

۳۲ تا ۳۹

{

## اقبال کی شاعری

سرودے ، نالہ ، آہ و فغان :-

## اقبال کا احتساب

۴۰ تا ۹۶

صرف ادبی نقطہ نظر سے :- حقائق و معارف ، فلسفہ ، درس ، پیام ، خطاب  
 ٹھوکر ، فکر سلسل ، اسرار و رموز ، فلسفہ ہست و بود -  
 سوال و انتظار ، حسن و محبت ، سوز و الم ، جدت و تشبیہ  
 طنز و تعریف - حسن و حکم - زبان و بیان - لغزل



# عرضِ نامہ

یہ مختصر سی کتاب تاج اردو سیریز کی یادگار ہے، تاج اردو سیریز کا سلسلہ اس لئے بند کر دیا گیا کہ مختلف جڑی چھوٹی کتابیں ضخامت اور قیمت کی پابندیوں سے آزاد رہ کر شائع کی جاتیں جو نہایت عمدگی سے پروگرام کے تحت شائع ہو رہی ہیں، جلد ہی وہ وقت آ رہا ہے کہ اردو کے بھی خواہ ہماری خدمات پر خوش ہونگے اور ابھی جیسے شہر میں اردو کے اس عظیم الشان اور بے نظیر اردو اشاعت گھر پر فخر کر سکیں گے۔

یہ کتاب تاج اردو سیریز کی اس لئے یادگار ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن تاج اردو سیریز میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اب یہ دوسرا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔

رشیخ، نذیر احمد  
مالک تاج آئین سن، ممبئی

# یہ کتابچہ

اقبال کی شاعری پر مختلف پہلوؤں پر بحث و گفتگو کا سلسلہ  
عرصہ سے جاری ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ خالص ادبی نقطہ نظر سے  
اقبال کی شاعری پر اب تک گفتگو نہیں کی گئی۔

اس گرافی کے زمانہ میں کوئی ضخیم کتاب نہیں پیش کی جاسکتی،  
سروسٹ اس ”کتابچہ“ پر اکتفا کیا جاتا ہے، پھر اگر موقع ہوا، حالات  
نے اجازت دی، اور ناشر صاحب آمادہ ہو سکے تو اس موموع پر  
ایک مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ ہے۔

اس کتابچہ میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے، اس کی حیثیت دُستے  
نمونہ از خروارے سے زیادہ نہیں ❖

رئیس احمد حفصی

# اقبال

## حالات و سوانح

اقبال کشمیر کے ایک برہمن خاندان کے چشم و چراغ تھے، جو گذشتہ کئی نسلوں سے سیالکوٹ میں مقیم تھا۔ اس خاندان نے اسلام قبول کر لیا تھا، اور اس اعتبار سے اقبال ”نوسلم“ تھے، انہیں خود بھی اپنے نو مسلم اور ترجمان اسلام ہونے پر ناز تھا، وہ خود کہتے ہیں۔

برہمن زاوہ راز آشنا سے روم و تبریزے!

اقبال کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ بڑے اللہ والے آدمی تھے، محدود پیمانہ پر تجارت کر کے گند بستر کرتے تھے۔

اقبال کے بڑے بھائی کا نام شیخ عطا محمد تھا، موصوف اب تک بقید حیات ہیں، ۱۸۷۳ء میں اقبال کتنم عدم سے عالم وجود میں آئے، یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم کی طرف راغب نہیں ہوتے تھے، ۱۸۵۷ء کا غدو ابھی کل کی بات تھی۔ کل تک وہ اس دیس کے حکمران تھے، آج ان کی حکومت قصۂ ماضی بن چکی تھی، اور وہ اسب کسمپرسی اور بیچارگی کی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن اقبال کے والد نے حالاتِ زمانہ کا اپنی طرح احساس کرایا تھا، انہوں نے اپنے ہونہار لڑکے کو انگریزی اسکول میں بھجوا دیا۔

اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب انگریزی تعلیم حاصل کر کے انجیئر بنے۔

اور اقبال مشن اسکول میں اپنی تعلیم کا ایک دور ختم کر کے کالج میں داخل ہو گئے۔

کالج میں انہیں مولوی میا حسن شافیق استاد بلا۔ موصوف فارسی اور عربی کے اہر تھے، اور ان کی تعلیم کا خاص گروہ یہ تھا کہ وہ اپنے شاگردوں میں عربی فارسی کا صحیح ذوق پیدا کر دیتے تھے۔ لائق استاد اور ہونہار شاگرد کے تعاون کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال کی نظر فارسی اور عربی پر بہت وسیع ہو گئی۔ فارسی میں تو انہوں نے اتنی مہارت پیدا کر لی کہ اسی زبان کو انہوں نے اپنی شاعری کا ذریعہ بنالیا۔ اقبال اپنے استاد مولوی میر حسن کا بہت احترام کرتے تھے اور ان سے بیحد محبت کرتے تھے۔ چنانچہ جب انہیں ان کی علمی قابلیت کی بنا پر ”سر“ کا خطاب ملا، تو انہوں نے اس وقت تک یہ خطاب لینا منظور نہ کیا جب تک ان کے استاد مولوی میر حسن کو ”شمس لہما“ کا خطاب نہ مل جائے اور بالآخر ان کا یہ مطالبہ پورا ہوا۔

ایف۔ اے کا امتحان پاس کر کے اقبال لاہور چلے آئے، اور مزید تعلیم کی تکمیل انہوں نے لاہور ہی میں کی،

گورنمنٹ کالج لاہور میں جہاں اقبال داخل ہوئے تھے، پروفیسر آرنلڈ کا شافیق استاد انہیں ملا۔ آرنلڈ کے فیض صحبت سے اقبال کے ذہن و دماغ میں جلا پیدا ہو گئی، یہاں انہوں نے ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کی، پھر اورینٹل کالج میں فلسفہ کے پروفیسر ہو گئے۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد وہ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو کر چلے آئے۔

## سفرِ یورپ

۱۹۰۵ء میں اقبال نے یورپ کا سفر اختیار کیا، اور لندن پہنچے، پھر وہ

کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہو گئے، اور فلسفہ کی مزید تکمیل کرنے لگے، یہاں تعلیم کی تکمیل کر کے وہ یورپ کے علم کدوں کے طوائف پر بھل گئے، پنی، اپنچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی، پھر لنڈن آئے، اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ پروفیسر آرنلڈ ہندوستان سے ایران واپس آچکے تھے، اور اب وہ کیمبرج یونیورسٹی میں عزنی کے پروفیسر تھے۔ وہ چھ مہینہ کی چھٹی پر گئے تو اقبال ان کی جگہ پروفیسر مقرر ہو گئے۔ اور کیمبرج کے طلبہ کو عربی پڑھاتے رہے۔

## وکالت کی اجازت

یورپ سے واپس آکر اقبال پھر گورنمنٹ کالج میں پڑھانے لگے، اب انہیں پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی، اور عدالت میں بیرسٹری کی حیثیت سے پریکٹس کی بھی اجازت تھی۔

دو اڑھائی سال انہوں نے کالج کی ملازمت جاری رکھی، پھر یکایک استعفا دے دیا۔ پرنسپل نے لاکھ لاکھ سمجھایا لیکن وہ اپنے ارادہ پر قائم رہے، وہ ملازمت کی گراناریوں کو پسند نہیں کرتے تھے، امن و اطمینان اور آزادی دے پروائی کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اب انہوں نے وکالت کی طرف سبنا زیادہ توجہ کی۔ لیکن اب بھی وہ اتنے ہی مقدّمے لیتے تھے۔ جن سے ان کے مصارف چل جاتیں۔ انہیں روپیہ کمانے کی ہوس نہیں تھی۔

## شادی

اقبال نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے مٹر آفتاب اقبال، بیرسٹران کے

صاحبزادے موجود ہیں۔

دوسری بیوی سے ”جاوید اقبال“ ہیں اور ایک صاحبزادی منیرہ بانو، اقبال جاوید کو بہت چاہتے تھے۔ دوسری بیوی سے بھی انہیں بہت تعلق خاطر تھا، لیکن اقبال کی وفات سے کچھ عرصہ پیشتر وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یہ صدمہ اقبال کے لئے ناقابلِ برداشت ثابت ہوا۔

اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا اقبال بہت خیال رکھتے تھے۔ جاوید اور منیرہ کی تربیت کے لئے انہوں نے ایک یورپین معتمد کا بند دلبست کیا تھا۔

## شاعری

اقبال کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا، وہ اجمیہ لکھوٹ کے مشن اسکول میں ایک نوعمر طالب علم تھے کہ انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیئے تھے۔ طبیعت بلا کی موزوں پائی تھی۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری بھی ترنن کرتی رہی، اور اس میں بچگی آتی رہی شروع شروع میں ان کی شاعری پر وطن پرستانہ رنگ غالب تھا، لیکن بعد میں ان کی شاعری یکسر ”پیام اسلام“ بن کر رہ گئی تھی، وہ دنیا کے تمام کچھ درد کا علاج یہ سمجھتے تھے کہ وہ اسلام کے اصولوں پر اور اس کے بنائے ہوئے نظام پر عمل کرے۔

ایک مشاعرہ میں مرزا ارشد گورگانی بھی موجود تھے، اقبال اجمیہ نوعمر تھے، لیکن انہوں نے بھی مشاعرہ میں اپنی غنڈل بڑھی، جب انہوں نے یہ شعر سنایا

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے قطرے جو تھے مرے عرفِ انفعال کے

تو سارا شاعر و پھر تک گیا، اور مرزا ارشد نے بھی جی کھول کر داد دی۔

اقبال شاعری میں ذائب مرزا خاں داغ کے فناگر تھے۔ داغ نے پہچان لیا تھا یہ جوہر قابل ہے۔ ایک روز آفتاب بن کر چمکے گا۔ انہوں نے اقبال پر کافی توجہ کی یہ وہ زمانہ تھا کہ داغ استاد حضور نظام کی حیثیت سے حیدر آباد مقیم تھے، اصلاح کا سلسلہ خط و کتابت کے ذریعہ جاری تھا، کچھ عرصہ بعد داغ نے اصلاح کا سلسلہ بند کر دیا۔ انہوں نے فرمایا اب اقبال اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہیں اصلاح کی ضرورت نہیں رہی۔

ستمبر ۱۹۲۲ء میں اقبال کے اردو کلام کا ایک مجموعہ ”بانگ درا“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اقبال اردو چھوڑ کر فارسی کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ اور اپنا پیامِ دنیا کے نام اُسی زبان کے ذریعہ دے رہے تھے۔

اقبال کی کتاب حسبِ ذیل ہیں۔

پیامِ مشرق

اسرارِ خودی

رموزِ بے خودی

زبورِ عجم

جاوید نامہ

بالِ جبریل

ضربِ کلیم

ارمغانِ حجازی

”زبورِ عجم“ پر خود اقبال کو بھی بہت ناز تھا، کہتے ہیں۔

۱۔ اگر ہودوق تو فرصت میں پڑھو زبور مجسم  
فغان نیم شبی بے نوائے راز نہیں  
ان میں سے اُن کی ہر کتاب ایک مستقل پیام اور دعوت کی حامل ہے۔

## سیاسیات میں حصہ

۱۹۲۵ء میں اقبال اپنے دوستوں کے اصرار سے مجبور ہو کر پنجاب کونسل کی ممبری کے لئے کھڑے ہوئے اور بہت نمایاں اکثریت سے کامیاب ہوئے، اس کے بعد سے انہوں نے برطانوی ہند کی سیاست میں متعلق طور پر حصہ لینا شروع کر دیا۔

لندن میں جو گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس کے آخری اجلاس میں بھی وہ مندوبانہ حیثیت سے شریک ہوئے۔

اسلامی ہند کی سیاسیات میں بھی وہ سرگرم حصہ لیتے تھے۔

۱۹۱۰ء میں ہنرمائیں آغا خان کی صدارت میں جو مسلم کانفرنس قائم ہوئی تھی۔ اس میں بھی انہوں نے نمایاں حصہ لیا، اور بعد میں اس کانفرنس کے صدر بھی ہوئے۔

مسلم لیگ سے بھی انہیں گہرا تعلق تھا، اور اس کی تحریکوں میں بھی وہ ہمیشہ حصہ لیتے رہتے تھے، ۱۹۳۷ء کے اجلاس الہ آباد کی انہوں نے صدارت کی تھی۔ اور اپنے خطبہ صدارت میں پہلی بار انہی نے پاک ان کا اشارہ کر کے مسلمانان ہند کے سامنے ایک واضح نصب العین رکھا تھا۔ اس وقت اس نظریہ کی سخت مخالفت ہوئی تھی، لیکن بعد میں یہ مسلک مسلم لیگ نے سرکاری طور پر نختیار کر لیا۔ اور آج مسلمانان ہند کا وہ مفصل زندگی بنا ہوا ہے۔



لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اقبال کو مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقوں اور قوموں سے پُر غاش مخفی، وہ ہر قوم اور ہر فرقہ کی محبت اپنے دل میں رکھتے تھے، "ہمالیہ" پر انہوں نے جو شاندار نظم کہی ہے۔ اسے کون بھول سکتا ہے، یا ہندوستان کا جو قومی ترانہ،

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا

ہم گبتیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

کہا ہے۔ اسے کون محب وطن نظر انداز کر سکتا ہے، یا "نیا سوال" کے عنوان سے انہوں نے جو نظم کہی ہے، اسے کون ہے جو درو سوز کے ساتھ نہ پڑھے، اسی طرح سوامی رام تریتا، گرو نانک، رام چند راجی وغیرہ پر انہوں نے جو نظمیں کہی ہیں، ان کے اثر، کیف، وقعت سچائی سے کون انکار کر سکتا ہے؟

اقبال کا دل، وہ دل تھا، جو انسانی محبت اور عظمت سے معمور تھا، اور یہی جذبہ تھا جس نے اسے شاعر مشرق بنا دیا۔ وہ کسی ایک قوم کا بھلا نہیں چاہتا ہے۔ بلکہ ساری دنیا کا بھلا چاہتا ہے۔ سب کو امن چین اور سکھ کی زندگی بسر کرنے کے طریقے بتاتا ہے۔

## آمدنی

شاعروں میں فقیدے کہتے کہتے، خودداری کا مادہ گھٹتے گھٹتے ایک "جوئے کم آب" رہ جاتا ہے، لیکن اقبال کے ہاں وہ بحرِ بے کراں کی صورت میں نظر آتا ہے۔

اقبال نے اگر خودداری کا راستہ نہ اختیار کیا ہوتا تو یقیناً اس کی آمدنی ہزاروں سے متجاوز ہوتی، وہ لائی کورٹ کا جج بن سکتا تھا۔ کونسل کا صدر بن سکتا تھا۔ کسی دربار کا سرکاری شاعر بن سکتا تھا۔ قصائد کہہ کہہ کر اپنے گراں قدر وظائف مقرر کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے

ان راستوں میں سے کوئی راستہ اختیار نہیں کیا، وہ فقر و قناعت کی زندگی کو امارت اور ثروت کی زندگی پر ترجیح دیتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اس کی زندگی ہمیشہ مالی مصائب کی شکار رہی لیکن اس نے اس کی ذرا بھی پروا نہ کی۔

وفات سے کچھ پیشتر ۲۰ یوم اقبال کے موقع پر ہندوستان کی ایک بہت بڑی ریاست کے وزیر اعظم نے ایک ہزار روپیہ کا چیک بطور تواضع ارسال فرمایا تھا۔ لیکن اس مرد قلندر نے پوری شاہانہ استغنا کے ساتھ،

غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبل  
جب کہا اُس نے یہ میری خدائی کی نشا

کہہ کر بعد شکر یہ اُسے واپس کر دیا،

جب تک اُن کی صحت اجازت دیتی رہی، وہ پریکٹس کر کے اپنے مصارف پورے کرتے رہے۔ لیکن زندگی کے آخری دور میں انہوں نے وکالت یکسر ترک کر دی تھی۔ اور آمدنی بہت محدود ہو گئی تھی۔ کتابوں کی فروخت سے جو آمدنی ہوتی تھی اس پر وہ قناعت کرتے تھے۔

سر اس مسعود مرحوم اقبال کی بہت عظمت کرتے تھے اور اُن سے بے حد محبت کرتے تھے، جب وہ بھوپال میں وزیر تعلیم ہو کر گئے تو انہوں نے اقبال کو بڑی محبت سے کئی بار بھوپال بلایا اور وہاں اُن کا علاج کرایا۔

انہی کی سعی و کوشش سے، نواب صاحب بھوپال نے پابنخ سو روپیہ ماہوار تناسبات کا وظیفہ اقبال کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ یہ رستم اقبال کے لئے کافی تھی۔

وہ اسپر قناعت کر کے اپنے علمی و ادبی کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔

## زندگی کا آخری دور

اب وہ تمام تر عزالت کی زندگی بسر کر رہے تھے، جلسوں، جلسوں، نشستوں سے انہیں کوئی سڑکار نہ رہ گیا تھا۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ اقبال مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، جلسوں کی صدارت کرتے تھے، انجمن حمایت اسلام لاہور کے عظیم الشان جلسوں میں انہوں نے "نائلہ پیہم" وغیرہ عنوانوں پر جو درد انگیز نظمیں پڑھی تھیں ان کی یاد اب تک لوگوں کے دلوں میں تازہ ہے، لیکن اب وہ یہ سب کچھ چھوڑ چکے تھے، علائق دنیوی سے اب انہیں کوئی تعلق نہ رہ گیا تھا، وہ تھے اور ان کا گوشہ عافیت!

اب وہ اپنا تمام وقت مخصوص علمی کاموں پر صرف کرنا چاہتے تھے۔ اور فرصت کا جو وقت ملتا تھا وہ ان کاموں پر صرف بھی کرتے تھے۔

## علامت

لیکن اب ان کی صحت گرنے لگی تھی، یوں تو ہمیشہ سے انہیں کچھ نہ کچھ شکایات رہیں، پندرہ بیس برس پہلے انہیں درد گردہ کی شکایت ہو گئی تھی۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں کا علاج کیا مگر صحت نہ ہوئی "آخر تنگ آکر یورپ جانے کا قصد کیا، لیکن خوش قسمتی سے ڈاکٹر الفارسی مرحوم کے بڑے بھائی حکیم نابینا صاحب انہیں بل گئے۔ اور ان کے علاج سے انہیں ایسی شفا ہوئی کہ یہ مرض تقریباً جانا رہا۔

اب پھر منفرد امراض نے ان پر حملہ کیا، اور انہوں نے ڈاکٹروں کے بجائے پھر حکیم ناسیہ کی طرف رجوع کیا، نامذہ اب بھی ہو رہا تھا لیکن فستار سست تھی۔

۲۵ء میں لیڈی اقبال کا انتقال ہو گیا، اس حادثہ نے انہیں بیمار بنا دیا، اب وہ بھی اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے، ایک روز بیٹھے بیٹھے انہوں نے وصیت نامہ بھی تیار کر دیا۔ اور اسے رجسٹرار کے پاس بھیج دیا۔

وفات سے سال بھر پیشتر ان کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا تھا، سانس بھی پھولنے لگا تھا، حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ اٹھ کر غسل خانہ تک بھی نہیں جاسکتے تھے۔ دسمبر ۲۵ء میں حالت اور زیادہ بگڑنے لگی، طبی اور ڈاکٹری علاج جاری تھا شفاء الملک حکیم محمد حسن صاحب ترشی اب ان کی دیکھ بھال کرتے تھے، شفاء الملک سے اقبال کو بڑی عقیدت تھی۔ وہ ان کی ذہانت اور قابلیت کے قائل تھے، اب وہ انہی کی مجوزہ دوا میں ہنٹال کرتے تھے۔

اب ان کا دل بھی بہت کمزور ہو گیا تھا، کبھی کبھی دونوں کندھوں کے نیچے میں درد بھی ہونے لگتا تھا۔ یہ بڑی خطرناک علامت تھی، لیکن اس حالت میں بھی فکر سخن کا سلسلہ جاری تھا، بحث و گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

جواہر لال نہرو ملاقات کے لئے آئے۔ ان سے دیر تک تبادلہ مخیالات کرنے پڑے۔ پٹنہ جی اس ملاقات سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

## وفات

حالت نازک ہوتی گئی، ایک روز ان کی نازک حالت دیکھ کر ان کے بڑے بھائی

شیخ عطاء محمد رونے لگے۔ اقبال نے انہیں نکیں دی۔ آکر کہا۔ آپ روتے کیوں ہیں؟  
پھر یہ شمر چڑھا۔

سہ نشاں مرد مومن با تو گوئم

چو مرگ آید تبسم برب است

اب یہ حالت ہو گئی تھی کہ پلنگ پر بیٹھے ہیں مجلس جمی ہوئی ہے، باتیں کر رہے ہیں کہ سانس اٹ گیا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ ذرا دیر بعد طبیعت سنبھلی اور پھر باتیں شروع کر دیں۔

رسالتکاتب سے اقبال کو غیب معمولی محبت اور شفقت کی تھی، اب تو حال یہ تھا کہ حضور کا نام لیا یا کسی سے سنا، آدرا آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

قرآن شریف بڑی خوش الحانی اور ترنم سے پڑھنے کے عادی تھے، اب ان کا کلا بیٹھ گیا تھا، اور دستار الحان اور ترنم سے نہیں پڑھ سکتے تھے، اپنی اس بے بسی پر وہ بہت ملول ہوتے تھے۔

ان کا ایک دیرینہ اور وفادار ملازم علی بخش تھا، ایک روز ان کی حالت دیکھ کر وہ رونے لگا۔ لوگوں نے اسے روکا، اقبال نے کہا، اسے جی بھر کے رو لینے دو طبیعت ہلکی ہو جائے گی۔ پیرانا ملازم ہے، اپنے بار خاطر کو دبا نہیں سکتا۔

اقبال کو موت کا ذرا بھی دھڑکا نہیں تھا، وہ جبری خوشی سے پیام موت پر ہر ایک کہنے کو تیار تھے۔

وفات سے تین چار روز پیشتر بلغم میں خون آنے لگا تھا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا، دل کی طرف جانے والی رگ کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہے، ۲۰ ستمبر کی شام

کو ڈاکڑوں نے کہا اب صرف چند گھنٹوں کے مہمان ہیں۔ اس رات کو تین بجے تک سوتے رہے، پھر اٹھے تو طبیعت بے کل تھی، صبح کے سوا پانچ بجے پاؤں پھیلا دیے۔ آنکھیں اوپر کی طرف اٹھائیں۔ دل پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے ”اللہ! یہاں درد ہے!“ ان کا خادم علی بخش ان کے پاس تھا، اس نے اپنا بایاں ہاتھ ان کے دل پر رکھا، اور داپہنے ہاتھ سے سر کو تھم لیا، اتنے میں انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ منہ خود بخود قبلہ کی طرف پھیر گیا، اور مشرق کا وہ سب سے بڑا شاعر ہمیشگی کی نیند سو گیا۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال اس عالم خاکی سے عالم باقی میں پہنچ گیا، جہاں نہ کوئی درد ہے نہ تکلیف، نہ دکھ ہے نہ مصیبت نہ اندیشہ نہ دھڑکا، انا للہ۔ وانا الیہ راجعون۔

## تجہیز و تکفین

وفات کی خبر آنا فائنا سارے شہر میں پھیل گئی۔ بازار بند ہو گئے اور لوگ جناوید منزل کی طرف آنے لگے۔ شام کو جنازہ اٹھا اور بادشاہی مسجد کے میناروں کے نیچے اقبال کو سپرد گوہر کر دیا گیا۔

اقبال کی وفات پر سارا ہندوستان تڑپ اٹھا۔ سرکاری اور غیر سرکاری، کانگریس اور مسلم لیگ، ہر حلقہ میں ان کا ماتم کیا گیا۔

ہندوستان کے باہر بھی اقبال کا سوگ منایا گیا، عالم اسلام میں بھی تعزیتی جلسے ہوئے، یورپ کے کئی شہروں میں بھی تعزیتی تجویزیں منظور ہوئیں۔

سرکندہ حیات خالی مرحوم مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لئے کلکتہ گئے ہوتے تھے۔ گورنر پنجاب سے شاہی مسجد میں تدفین کی اجازت لی گئی۔ جو انہوں نے اذراہ عنا

خوڑا دے دی اور اقبال وہیں ہمیشہ کے لئے چین کی نیند سو گئے ہمیشہ ہے نام اللہ کا  
 مسلمانوں میں جو بڑے لوگ اپنی جگہ خالی کرتے ہیں ان کا کوئی جانشین نہیں  
 ملتا۔ اقبال نے اپنی جگہ خالی کر دی، اور آئمہ اسلامی ہند میں کوئی نہیں ہے جو اس خالی  
 جگہ کو پُر کر سکے۔

---



# اقبال

## تاثرات و مشاہدات

از: رئیس احمد جعفری

میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ایک طالب علم تھا، جامعہ کے اساتذہ میں نذیر نیازی صاحب کو اقبال سے خصوصیت تھی۔ انہوں نے ایک ”حلقہ اقبال“ قائم کر رکھا تھا، اس حلقہ میں، اس مرد حق آگاہ کے کلام و بیان کی تشریح و تفسیر ہوتی تھی۔ اس کے خیالات و حیات کو اجاگر کیا جاتا تھا۔ اس کی فکر آسمان پیا، اور اس کے پیغام حیات آفرین پر محبتیں ہوتی تھیں، اس کے مشکل اور دقیق اشعار کی مشکل کشائی ہوتی تھی، اس کے انداز بیان اور اسلوب کلام پر نقد و تبصرہ ہوتا تھا، ہم لوگ سامع کی حیثیت سے بیٹھتے تھے، اور نیازی صاحب کیلئے ہزار داستان کی طرح اپنی خوش بیانی اور معنی آفرینی سے ایک سماں پیدا کر دیتے تھے، میں اس حلقہ میں باقاعدہ شریک نہیں ہوا تھا۔ کبھی کبھی چلا جاتا تھا، لیکن اقبال کی جو عظمت میرے دل میں بیٹھی ہوئی تھی، وہ اس کبھی کبھی کے شریک حلقہ ہونے سے اور بڑھ گئی تھی، واقعہ یہ ہے کہ نیازی صاحب کا اقبالیات پر نہایت وسیع اور گہرا مطالعہ تھا اور چنانچہ اکثر و بیشتر انہیں خود بھی اقبال سے براہ راست مستفید ہونے کے مواقع ملتے رہتے تھے، اس لئے اس مسئلہ پر، وہ امام کی حیثیت رکھتے تھے۔

سلسلہ میں اقبال کسی کام سے دہلی آئے۔ ارباب جامعہ نے طے کیا کہ انہیں



ایک پارٹی دی جائے، اور اُن سے تبادُلہ خیالات کیا جائے۔ اس موقع پر تعلیمی مرکز نمبر ۱۰ کا مال سجا یا گیا۔ اسی کے اندرونی صحن میں پارٹی کے اشتغالات ہوئے، ساتھ ہی ساتھ مکتبہ جامعہ کے مطبوعات کی نمائش بھی کی گئی۔

سہ پہر کو علامہ تشریف لائے، سب سے پہلے اساتذہ اور سربراہانِ حاضریں کا موصوف سے تعارف کرایا گیا، میں انجمن اتحاد (یونین) کا نائب صدر تھا، میرا تعارف بھی کرایا گیا۔ حضرت علامہ مطبوعات جامعہ کی نمائش کا نظارہ کرتے ہوئے آگے بڑھے، اُن کی نظر ”سیرت محمد علی“ پر پڑی یہ میری پہلی تصنیف تھی، اسے میں نے طالب علمی ہی کے زمانہ میں ترتیب دیا تھا اور ابھی شائع ہوئی تھی، اب علامہ سے میرا مزید تعارف ہوا، .. سیرت محمد علی“ مصنف بھی یہی ہیں!

حضرت علامہ رک گئے، کتاب اٹھائی اور اُسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ نہایت شفقت سے میرے کاغذ پر ہاتھ رکھا، منہ رایا، بہت سوچا، میں محمد علی کے بارے میں ایسے بتا سکتا ہوں جو صرف مجھی کو معلوم ہیں۔ ان سے بھی فائدہ اٹھا لیتے! میں نے کہا ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔ میں تو ایسے نادر معلومات کا جویا ہوں، بات ختم ہوئی، علامہ آگے بڑھے، اور حلقہ اساتذہ میں جا کر بیٹھ گئے، میں طالب علموں کے ساتھ ایک گوشہ میں کھڑا ہوا، نگاہ عقیدت سے اُن کا نظارہ کر رہا تھا۔ اس وقت مجھے اُن کی وہ نظم یاد آ رہی تھی، جو ۱۹۲۰ء میں انہوں نے ”محمد علی شوکت علی“ کی طویل نظر بندی اور سنایا بی۔ سے رہائی کے موقع پر کہی تھی

ہے اسیری امت بار افزا جو ہو فطرت بلند      قطرہ نیاں ہے زنداں صدف سے ارجمند  
شک از فرح چید کیا ہے اک لہو کی بوند ہے      مشک بن جاتی ہے ہو کر نافہ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں نذرست مگر کم ہیں وہ طاہر کہ ہیں دم و قفس سے بہر مند  
”شہپر زاغ وزغن در بند قید و جید نیست

ایں سعادت قسمت شہباز و ثنا ہیں کردہ اندا“

جس شاعر اعظم نے محمد علی کی عظمت کا ان بلند الفاظ میں عمت اف کیا، اس کے  
”ادرمعلومات یقیناً محمد علی سے متعلق خاص طور پر قابل اخذ و استفادہ ہوں گے، یہ سوچتے سوچتے  
مجھے اقبال کی نظم یاد آگئی، جو اس نے ”دریوزہ خلافت“ کے نام سے کہی تھی، یہ نظم اس وقت  
کہی گئی تھی، جب محمد علی ”دفد خلافت“ لے کر یورپ گئے تھے۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی  
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا خلافت کی کرنے لگا تو گدائی  
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے مسلمان کو ہے تنگ وہ پاؤں ثنائی

”مرا از شکستن چپناں عار ناید“

کہ از دیگر اغواستن مویائی!“

کتنا خود دار ہے یتیم!

یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلم کانفرنس مسلمانوں پر چھائی ہوئی تھی، عوام کو تو کچھ اس  
سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی، لیکن خواص، . . . . سرخان بہادر، دولتمند . . . .  
اس محور کے گرد گردش کر رہے تھے، مسلم کانفرنس مسلم سیاست پر اسی طرح اثر انداز تھی  
جس طرح آج کل مسلم لیگ نظر آ رہی ہے۔

سرآغا خان، اس کے پہلے صدر تھے، سر محمد شفیع، سرفراز فقار علی خاں اور اس  
 پنج کے دوسرے ارباب ہم اس کے خاص الخاص کارکنوں میں تھے۔ اب اس کی صدارت پر  
 اقبال فائز تھے، یہ صدارت اقبال کے لئے باعث اعزاز نہیں تھی، البتہ مرحوم مسلم کانفرنس  
 کی روح تا اب اس پر نازاں ہے مگر کہ اس کی صدارت کی کرسی پر، مشرق کا سب سے بڑا شاعر  
 حیات متمکن ہو چکا ہے۔

اسی مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا جلسہ تھا۔ اقبال لاہور سے دہلی آئے۔ اب کی  
 دہلی میں مولوی محمد شفیع داؤدی ایم، ایل۔ اے کی قیام گاہ پر مقیم ہوئے۔ رشام کو میں محمد علی  
 ہوسٹل سے کسی کام سے جا رہا تھا کہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب سے ملاقات ہوئی، موصوف  
 نئی دہلی اقبال سے ملنے تشریف لے جاتے تھے۔ ازراہ کرم گسٹری مجھے بھی اپنے ساتھ  
 لے لیا۔ ہم لوگ نئی دہلی پہنچے شفیع داؤدی صاحب کی قیام گاہ پر اس وقت بہت سے لوگ  
 جمع تھے، مسلم لیگ کے لیڈر مسلم کانفرنس کے رہنما خلافت کے پُرانے کارکن مرکزی اسمبلی کے  
 ممبر، اور بعض وہ لوگ بھی موجود تھے جو برطانوی ہند کی سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔  
 مثلاً مشرعیب تیشی،

علامہ اپنے کمرے سے تشریف لائے، کسی سے معاف نہ کسی سے مصافحہ، کسی  
 سے آنکھوں آنکھوں میں پیام سلام ہوا، سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے، اور باتیں  
 شروع ہو گئیں۔

کچھ دیر بعد علامہ نے ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی طرف رجوع کیا، اور گفتگو  
 شروع ہو گئی، گفتگو کا موضوع سیاسی نہیں تھا، علمی اور تاریخی تھا۔ باتوں باتوں میں ہر قسم  
 کے مباحث چھڑ جانے لگے۔ علامہ کی گفتگو کا عام اندازہ یہ تھا کہ گفتگو اردو میں شروع کرتے

تھے، اور بہت جلد انگریزی پڑھا جاتے تھے۔ پھر کبھی انگریزی میں بات کرتے رہتے، کبھی اردو میں تقریباً دو گھنٹہ تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصہ میں نہ معلوم کتنے مباحث پر گفتگو ہوئی، لیکن ہر بحث پر اتنی جامع و مانع، اتنی مکمل، اتنی سیر حاصل اور اتنی شگفتہ گفتگو ہوئی کہ میں نو علامہ کی حاضر دماغی پر حیرت ہوئی، وسعتِ علم، اور بلندیِ فکر پر عیش عرش کر گیا۔ اقبال کی شاعری، ان کی فلسفہ دانی، ان کی قابلیت، ان میں سے ہر چیز اصول موضوعہ کی طرح اپنی جگہ پر قائم تھی، لیکن یہ آج اندازہ ہو، کہ نج کی محبتوں میں بھی اقبال کی شخصیت کتنی دل آویز، کتنی پُرکشش اور کتنی بحر طراز تھی؟

اس مجمع میں بڑے بڑے اہل علم و دانش موجود تھے۔ بڑے بڑے مفکر اور ریاس موجود تھے بڑے بڑے محکمہ رس اور ہمدان موجود تھے، بڑے بڑے دانا و بیسنا اور اربابِ بینش موجود تھے۔ لیکن اقبال کے علم، اس کی ہمدانی، اس کی معرفت، اور اس کے داب و دانش کے سامنے سب طفلِ مکتب معلوم ہو رہے تھے۔ مجھے ”کتابِ لاغانی“ کا وہ قصہ یاد آ گیا جب عہدِ ہاروں الرشید کے نہرو مخفی ابراہیم حوصلی نے اپنے بیٹے اسحق کو اس عہد کے کامل فن ماہر غنا ابن جامع سے ملایا تو ابن جامع نے باپ بیٹے کی فطرت و دانش سے مجبور ہو کر اپنے راگ سنائے مجلس ختم ہوئی ار یہ دونوں واپس آ گئے، راستہ میں ابراہیم نے اسحق سے پوچھا کہ بوسٹا ابن جامع کو کیا پایا؟ اسحق نے کہا اگر آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کروں؟ ابراہیم نے پھر اصرار کیا تو اسحق نے کہا نہ آپ سے بڑھ کر راگ راگنی کے فن میں کسی کو بھی میں نہیں سمجھتا تھا، لیکن ابراہیم کو سننے کے بعد آپ کچھ نہیں ہے۔“

یہی حال مبرہ تھا۔ اس مجمع میں متعدد اصحابِ لیے تھے جن کے علم و فضل، مہارت و قابلیت، ذہانت و فکاہ کا میرے دل پر گہرا بیجا ہوا تھا، لیکن اس مجلس میں سب

بظفل کم سواد نظر آ رہے تھے، اور اقبال ایک یگانہ شخصیت کی طرح جلوہ آ رہا تھا، جو سب پر چھایا ہوا تھا، سب جس کے سامنے گردن جھکائے ہوئے تھے۔

۳۳ء میں عالم اسلام کی مایہ ناز شخصیت غازی رؤف، پاشا کوڈاٹر انصاری مرحوم امیر جالندھر جامعہ نے دہلی آکر توسیعی خطبات دینے کی دعوت دی، رؤف پاشا نے یہ دعوت بہ سرت منظور کر لی اور ہندوستان کو اپنے قدوم سینت لزوم سے انہوں نے مشرف فرمایا۔

رؤف پاشا خلافت عثمانیہ کے دور میں ایک ممتاز اور نمایاں شخصیت رکھتے تھے حمید یہ جہاز کے سلسلہ میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے، ان سے ایک دُنیا واقف ہے، یہ خلیفۃ المسلمین کی حکومت کے امیر البحر تھے۔ پھر انقلاب کے بعد بھی یہ ترکی میں بڑے بڑے مناصب پر فائز ہوئے، بعد میں مصطفیٰ کمال پاشا سے اور ان سے اختلاف ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ترکی چھوڑ کر ایک بلادین کی طرح پیرس میں بسنے لگے۔ قبل اُس کے کہ رؤف پاشا ہندوستان پہنچیں ان کا نام نامی ہندوستان پہنچ چکا تھا، مسلمان تو مسلمان ہندوستان کے غیر مسلم بھی اُن کی شخصیت میں غیر معمولی جذب و کشش محسوس کر رہے تھے۔ جامعہ میں اُن کے لیکچروں کا سلسلہ شروع ہوا، تو ہجوم کا یہ عالم تھا کہ ہال میں بل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ کئی روز تک خطبات کا سلسلہ جاری رہا ہر روز صدارت کے سرائے اسلامی ہند کی کوئی معتد شخصیت انجام دیتی تھی۔

ایک جلسہ کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی۔ جلسہ رات کو تھا۔ علامہ صبح فریڈر میل سے تشریف لے آئے، جامعہ کے طلباء اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد دہلی کے اسٹیشن پر استقبال کے لئے موجود تھی، اس مرتبہ علامہ نے غالباً پروفیسر محمد مجیب جی کی

کوٹھی رسول باغ، پر قیام فرمایا۔

جلسہ کا وقت آ گیا۔ ہال کچھ کچھ بھلا ہوا تھا، تھالی پھینکتے تو سر ہی سر جائے۔ ایک تو روٹ پاشا کی دلربا شخصیت۔ دوسرے اقبال کی صدارت، سونے پر سہاگہ، آج ہجوم اور زیادہ تھا، بہت زیادہ تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مدظلہ رشخ الجامعہ نے ایک نہایت اسی فصیح و بلیغ اور زبردست تقریر میں پہلے اقبال کی شخصیت اور اس کی شاعری کا ثارف کرایا، پھر صدارت کے لئے ان کا نام پیش کیا۔

توقع تھی کہ اقبال اردو میں تقریر کریں گے۔ لیکن انہوں نے شاید مجمع کی مناسبت سے انگریزی ہی کو تقریر کے لئے پسند کیا۔ جیسی معرکہ آنا تقریر کی علامہ نے اس مجمع میں ابھی کچھ عرصہ پیشتر علامہ سفر پورپ سے واپس آئے تھے۔ تیسری گول میز کانفرنس میں وہ مندوب کی حیثیت سے حکومت ہند کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ گول میز کانفرنس کے بعد علامہ نے اپنی ایک بریہ آرزو بھی پوری کی، یعنی اسپین کی سیاحت یہ وہ سرزمین تھی۔ جہاں صدیوں مسلمانوں نے حکومت کی تھی، بادشاہت کی تھی۔ اور وہ بھی اس جاہ و جلال کے ساتھ کہ دیارِ رنگ ان کے نام سے لرزہ بر اندام ہو جاتا تھا۔

اب اسپین میں مسلمانوں کا وجود ختم ہو چکا ہے، ان کی حکومت قصۂ ماضی بن چکی ہے۔ لیکن اب بھی وہاں کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کے ثقافت کے نشانات موجود ہیں۔ اب بھی وہاں قصر الحمرا کے کھنڈر، مسجد زہرہ کے باقیات الصالحات، اور عہدِ اسلامی کی تعمیرات کے آثار موجود ہیں۔

اقبال ابھی ابھی اس سفر سے واپس آئے تھے، تاثرات ازہ تھے اور وہ شمار کی صورت اختیار کر رہے تھے، ان کی نظم ”ہسپانیہ“ ابھی منظر عام پر نہیں آئی تھی، لیکن



مجرمانِ راز اور خلوتیانِ حرم کی معرفت ایک آدھ شعر، حکومت سے خلوت سے جلوت میں آچکا تھا۔

سپانیہ تو خونِ مسلمان کا میں ہے      مانند حرمِ پاک ہے تو میری نظر میں  
پوشیدہ تری خاک میں سجدہ کئے نشان ہیں      خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں  
روشن تھیں ستاروں کی طرح انکی نائیں      خیمے تھے کبھی جگمگے ترے کوہِ دگر میں  
پھرتیرے حسینوں کو منور تہِ محراب کی      باقی ہے ابھی رنگِ مے خونِ جگر میں  
کیونکر خس و خاشاک سے دب جائے سلا      مانا وہ تبت تاب نہیں اس کے شر میں  
غناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے لیکن      تسکینِ مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں  
دیکھا بھی دکھایا بھی سنایا بھی سنا بھی      ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں  
اب اقبال کی شاعری پھر اردو کا جامہ حریر پہن رہی تھی۔

بہر حال اقبال نے تقویرِ شعر کی، ساامج گمش بر آواز تھا۔

اس تقریر میں انہوں نے فرانس کے مشہور فلسفی برگسٹاں سے بھی اپنی ملاقات کا ذکر کیا اور فرمایا، جب میں نے اُسے "لا تسوا الہم وانا الہم" یعنی خدا کہتا ہے، زمانہ کو جبراً نہ کہو میں خود زمانہ ہوں، سنایا تو وہ اسلام کے اس فلسفہ پر بھونچکا رہ گیا۔

اسی تقریر میں انہوں نے اپنے چند تازہ اشعار بھی سنائے۔ لیکن اس لحاظ اور طرز میں نہیں، جس کی گونجِ حجابیتِ اسلام کے جنموں میں اکثر دہشتِ رسانی جاتی تھی، بلکہ تحت اللفظ، لیکن اس تحت اللفظ میں بھی جو اثر، جو کیفیت جو جادو تھا اُسے سننے والے اب تک نہیں بھولے ہیں۔ نہ شاید کبھی بھول سکیں۔

قبل اس کے کہ وہ اشعار درج کئے جائیں، ان کا پس منظر بھی اگر پیش کر دیا

نو مناسب نہ ہوگا۔

اسپین پر ایک عرصہ دراز تک مسلمانوں نے حکومت کی۔ اس دوران میں وہ وہاں اجنبی نہیں رہے بلکہ کھل کر گئے۔ عیسائی خاندانوں سے انہوں نے رشتہ ازدواج بھی قائم کیا، پھر وہ دور آیا کہ مسلمانوں کی نا اتفاقی اور باہمی مخالفت کی وجہ سے ان کا شیرازہ بکھریا، اور وہ اندلسی حکومت جس کی طرف یورپ کی بڑی بڑی حکومتیں نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتی تھیں، اور جس کی عظمت، ہیبت و دبدبہ، سطوت اور جلال کا یہ عالم تھا کہ سارا فرنگستان اُن سے بیدارنواں کی طرح کانپتا تھا، اسپین پر لوٹ پڑا، اور اسلامی حکومت ختم ہو گئی۔ صرف یہی نہیں ہوا کہ اسلامی حکومت ختم ہو گئی، بلکہ یہ بھی ہوا کہ مسلمان بھی وہاں سے نکال دیئے گئے۔ یہ الحبزائر، ٹیرنس، رلیف وغیرہ کے عربوں کا جو نام آپ سنتے ہیں یہ زیادہ تر وہیں کے خاندان ہیں، جو اسپین سے ہجرت کر کے، یا جلا وطن کر کے یہاں بھیجے گئے۔ اور پھر یہیں کے ہوئے۔

لیکن کچھ خاندان ایسے بھی تھے، جو اسپین ہی رہ گئے اور وہاں کے نئے ماحول سے اتنے متاثر اور مرعوب ہوئے کہ انہوں نے عیسائی مذہب بھی قبول کر لیا۔ عربی زبان کے ایک مشہور اثنابرداز نے ایک مختصر لیکن بلند پایہ کتاب "اندلس کا ماضی اور حال" کے عنوان سے لکھی تھی۔ اس کتاب میں بہت سے اہم اور دلچسپ مباحث پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں یہ انکشاف بھی ہے کہ قدیم عرب خاندان جو بعد میں عیسائی ہوئے تھے۔ آج بھی اسپین میں موجود ہیں، وہ اب بھی وہاں عیش و نشاط کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دولت و امارت اُن کے گھر کی ٹونڈی ہے، وہ لارڈ ہیں، نواب ہیں، جاگیردار ہیں، زمیندار ہیں، دولت مند ہیں، اور وہاں کی سیاسی اور سماجی زندگی پر



اثر رکھتے ہیں۔ انہیں اسپر فخر ہے کہ ان کی رگوں میں غرب خون دوڑ رہا ہے، بعض خاندان تو ایسے ہیں جو اپنے ”صلیقی“ اور غارتی“ ہونے پر ناناں ہیں۔

شاعر مشرق، جب اہلسنہینچا تو صرف ایک عام زائر اور سیاح کی حیثیت سے اس نے کوچہ گردی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ بنظر غائر و ماں کے لوگوں کا، ان کے رہتے پہننے کا، ان کے طور طریق کا، ان کے اصول اور ضابطہ کا مطالعہ کیا۔ اس کی آنکھوں نے بھی وہی دیکھا، اور پایا۔ جس کی طرف کچھ عرصہ پیشتر ایک عرب مصنف اور انشا پرداز اپنی ایک مایہ نادر تصنیف میں اشارہ کر چکا تھا، اور اپنے تاثرات کو ایسے الفاظ میں قلمبند کیا کہ پڑھنے والے ہمیشہ پڑھیں گے اور روئیں گے، صنفے والے سنیں گے اور مڑھیں گے۔

اقبال نے اس جلسہ میں جو اشعار سنائے، وہ ایک طویل نظم ”مسجد قرطبہ“ کا ایک حصہ تھے، یہ وہ مسجد ہے، جو آج بھی موجود ہے اور اپنی گزشتہ عظمت کا فسانہ زبان و در سے سنار ہی ہے وہ اشعار جو اقبال نے اس مجمع میں سنائے یہ ہیں:-

کعبہ ارباب فن، سطوت دین بیس  
تجھ سے حرم مرتبت اندلیوں کی زمیں  
ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیسری نظیر  
قلب مسلمان میں ہے اور نہیں ہے کہیں  
آہ وہ مردان حق! وہ عربی شہسوار  
عالم ”خلق عظیم“! صاحب صدق و یقین

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب  
 سلطنت اہل دل فخر ہے شاہی نہیں  
 جن کی لگا ہوں نے کی تربیت شرق و غرب  
 ظلمت یورپ میں تھی جن کی خسرو راہ میں  
 جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی  
 خوش دل و گرم اخلاط سادہ روشن جیس  
 آج بھی اس دیں میں عام ہے چشم غزال  
 اور لگا ہوں کے تیر آج بھی ہیں دلنشیں

بوئے تین آج بھی اُس کی ہواؤں میں ہے

رنگِ حجاز آج بھی اُس کی نواؤں میں ہے

دیدہ انجمن میں ہے تیری زمیں آسمان  
 آہ ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذان  
 کون سی وادی میں ہے کوئی منزل میں ہے  
 عشقِ بلاخیز کا قافلہ سحتِ حباں  
 دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاح دیں  
 جس نے نہ چھوڑے کہیں عہد کہن کے نشان  
 حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کفشت  
 اور ہوئی فکر کی کشتی نازکے واں

چشمِ فرانسس بھی دیکھ چیکے افتلاب  
 جس سے دگر ہوں غریبوں کا جہاں  
 ملتِ رومی نثرِ اکہنہ پرستی سے پیر  
 لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوتی پھر جواں  
 روحِ مسلمان میں ہے آج وہی اغطراب  
 رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں !  
 دیکھئے اس محرکی تہ سے اچھلتا ہے کیا  
 گنبدِ نیلوفرِ رنگ بدلتا ہے کیا

یہ اشعار اقبال نے تہتم سے نہیں پڑھے تھے بلکہ تحت اللفظ انہیں پڑھا تھا۔ پھر بھی  
 تاثر کا یہ عالم تھا کہ مجمع پر سننا اچھا یا ہونا تھا کانِ علی رؤوسہم السلام !  
 مجھے اقبال سے ملاقات، یا اخباری زبان میں "انٹرویو" کی سعادت نہیں حاصل  
 ہوئی، البتہ مجھے ان کے نظارہ کا دو ایک مرتبہ موقع ملا۔ یہ تاثرات و نقوش، اسی اجمال  
 کی تفسیر ہیں۔

# اقبال کی شاعری

سرودے، نالہ، آہ و فغانے!

اقبال کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا، وہ  
سرودے، نالہ، آہ و فغانے!

پرستش ہے! اقبال کی شاعری سرود و نغمہ بھی ہے نالہ و فغان بھی، اور آہ و شیون بھی!  
شروع میں اس کی شاعری میں آہ و شیون کے ساتھ نغمہ و سرود کا رنگ بھی شامل  
تھا، وہ اگر ملک و قوم کے حال پر آنسو بہاتا تھا، تو بہار کی رعنائیاں اور موسمِ گل کی طرب زائیاں  
حسن بے محابا کی رنگینیاں جلوہ عام کی دلربائیاں، کوہ و دشت کے مناظر، باغ و بہار  
کی کیفیتیں، کنار آب اور لب جوہار کی کیفیتیں، جگنو کی چمک، تاروں کا ہنسم  
کہکشاں کا روپ، اور سپاند کی چاندنی بھی اُس کا دل اپنی طرف کھینچتی تھی۔ وہ مجمع  
اجاب میں!

افسردہ دل افسردہ کندا بچنے را

کا مصداق بسکدر نہیں پہنچتا تھا، بلکہ بلبل ہزار داستان کی طرح نغمہ سرائی کرتا تھا  
اس کے ترنم سے جلسوں کے پندال اور بزمِ اجاب کے درود و ارگو بجا کرتے تھے۔  
پھر بعد میں وہ دور آیا کہ اقبال کی شاعری یکسر آہ و نالہ، یکسر فغان و شیون

یکسر درد و کرب، یکسر الم و اتہاب بن کر رہ گئی، وہ خود رونما تھا، اور دوسروں کو رلاتا تھا۔ اب اس کا پیام ایک ہی رہ گیا تھا۔

بہ مصطفیٰ برسوں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ احد نہ رسیدی تمام بولہبی است

وہ ہندوستان کا ایسا شاعر نہیں تھا جو صرف گلی و بلبل کے افسانے سناتا ہے، جو تیر نظر اور سنان نگاہ کا مرنیہ خواں ہوتا ہے، جو دردِ دل اور فغانِ جگر کا علمبردار ہوتا ہے، جو فسانہٴ عمِ دل اور داستانِ رنجور شی تن کا ماہِ دار ہوتا ہے۔ جو کنگھی چوٹی، سرد اور کاجل، انگیا اور موبان میں پٹارہتا ہے، جو ہجر کی داستان بیان کرتا ہے، تو مبالغہ کی ساری قوت صرف کر دیتا ہے۔ وصال آ کر کہا: ہستنا ہے تو ہر غم بھول جاتا ہے جو

عجب عاشقی چلیت بگو بندہٴ جاناں بودن!

کا منظر تمام بن کر رہ جاتا ہے، جو اپنے معشوق کے جو روستم کا حال بیان کرتا ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے نمرود و فرعون، چنگیز و ہلاکو، سکندر اور سیہندو، ہٹلر اور موسولینی، اس کے شاگرد رشید ہیں۔ رقیب کی کامیابیوں اور کامیابیوں کا ذکر کرتا ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رقیب اور محبوب گلے مل رہے ہیں، راز و نیاز میں مصروف ہیں، سرگرمِ اختلاط ہیں۔ اور یہ عاشقِ دلِ فگار، اپنی چشمِ مجبور سے یہ تماشا دیکھ رہا ہے، پھر بھی محبت کا یہ عالم ہے کہ عشق سے دستبردار ہونے کا نام نہیں لیتا۔ اپنے عشقِ کامیاب کو موضوعِ انجمن بناتا ہے تو اس طرح کہ،

تم جسے یاد کرو پھر اسے کیا یاد ہے نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے

وہ یہ نہیں جانتا ہے کہ اس دنیا میں کیا ہو رہا ہے ؟ اسے یہ نہیں معلوم کہ اس کے دیس پر کیا گزر رہی ہے وہ اس سے نا آشنا ہوتا ہے کہ اس کی ملت کس مصیبت میں گرفتار ہے ، اسے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ اس کے ابنائے ملت کس دور سے گزر رہے ہیں ۔ اسے اس کا اندیشہ نہیں ہوتا کہ کوئی انقلاب آ رہا ہے ؟ یا نہیں ؟ آ رہا ہے تو اس کے جہلوں میں کیا ہے ؟ اگر انقلاب خون بہانا ہوا آگ برساتا ہوا ، ہڈیاں روندنا ہوا آ بھی جاتا ہے ، تو بھی وہ شراب محبت میں مست رہتا ہے ، اس کی دنیا اس جھنگے کی دنیا ہے جو گولہ میں بند رہتا ہے ۔ اور قطعاً نہیں جانتا کہ اس چار دیواری سے باہر کیا ہو رہا ہے ؟ جو علم و دانش کی دنیا کا سیاح بھی نہیں ہوتا ، بالعموم یہ بھی نہیں جانتا کہ تاریخ کا اشارہ کیا ہے ؟ فلسفہ کی تعلیم کیا ہے ؟ نفعیات انسانی کا اقتضا کیا ہے ؟ عقد اجتماعی کا محور و مرکز کیا ہے ؟ فیضیت کیا ہے ؟ اشتراکیت ہے ؟ فاسطیت کیا ہے جمہوریت کیا ہے ؟ اور ان سب کے اثرات قوم و ملک پر کس طرح اور کیا مترتب ہوتے ہیں ؟ اور اگر کبھی اتفاقاً اور برسبیل تذکرہ وہ فیضیت کے بارے میں کچھ کہتا ہے ، تو طفل دبستان کی طرح بے منکم باتیں اشتراکیت کے باب میں اس کا لفظی رنگیں تصور کی رنگینی سے آگے نہیں بڑھتا ، فاسطیت کی بنیاد و اساس بھی اس کے ذہن و دماغ سے ماورا نہ ہے اور جمہوریت کے نشان قدم پر اگر وہ چلنا بھی ہے ، تو گر گر کر ،

لیکن شاعروں کے اس ہجوم عام میں اقبال سب سے الگ ہے ، سب سے ممتاز ہے ، سب میں منفرد ہے ۔ اس کی انفرادیت کا وقار ایسا نہیں جسے نظر انداز کیا جاسکے ۔

وہ ایک باخ نظر شاعر ہے، اس کے علم کا یہ حال ہے کہ وہ مشرق و مغرب کا سنگم ہے اس کا بچپن مشرق کے گہوارہ میں گزرا ہے، اور جوانی مغرب کے کفر سامان ماحول میں بسر ہوئی ہے۔ اس نے جس ذوق سے مشرق کا فلسفہ پڑھا ہے، اس سے کہیں زیادہ شوق سے فلسفہ مغرب کا درس لیا ہے۔ وہ جس طرح ایشیا کے علوم کا ماہر ہے۔ اسی طرح یورپ کے علوم بھی اس کے دماغ میں بے بسے ہوئے ہیں، وہ علم کو قید مقامی سے آزاد سمجھتا ہے، اسی لئے جہاں کہیں بھی اسے علم ملتا ہے لے لیتا ہے، وہ علم کا کوئی گوشہ چھوڑتا نہیں، وہ تاریخ پر نظر رکھتا ہے، فلسفہ کا وہ امام ہے، اقتصادیات پر اس کی گہری نگاہ ہے۔ علم الاقوام بھی اس کے ذہن و دماغ میں رچا ہوا ہے، وہ دنیا کے نئے رجحانات اور تصورات سے بھی ناواقف نہیں ہے، وہ قیصریت کا بھی ادا شناس ہے، وہ فاسطیت کے رموز بھی جانتا ہے، وہ جمہوریت کے اسرار کا بھی ماہر ہے وہ اشتراکیت کی گہرائیوں میں بھی غوطے لگا چکا ہے، عنصرِ دنیا کی کوئی تحریک کوئی رجحان کوئی تصور ایسا نہیں ہے، جس سے اقبال واقف نہ ہو، جس کا اقبال نے مطالعہ نہ کیا ہو، جس کے حرکات پر اقبال کی نظر نہ ہو، وہ سنساری اور مقامی، نظریات جدید و قدیم کو بھی جانتا ہے۔ انہیں پرکھ چکا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری صرف غزل (گفتگو با محبوب) نہیں ہے اس کی شاعری مقید نہیں ہے، اس کی شاعری درودِ دل کا لٹخہ بیچیدہ، اور محبہ وصال کی طلسم ہر شہرہ نہیں ہے۔ اس کی شاعری چشمِ میگوں۔ ساقِ سیہیں، ساندازِ ک رنجِ تاباں، گیسوئے پرخشم چہرہ زیبا، خرامِ ناز، اور گلگونہ عارض کی پیامبر نہیں ہے،



وہ عاشق ہے لیکن کس کا؟

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے  
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا!  
وہ انسان کا، قدرت کی آخری مہر مندی کا، خالق موجودات کے شاہکار کا، خدا کی سب  
سے زیادہ حسین مخلوق کا — انسان کا — عاشق ہے۔

اس کی شاعری کا موضوع صرف یہ ہے کہ انسان کا دکھ درد و دور ہو جائے، وہ  
سکھ اور چین کی زندگی بسر کرے۔ اس پر ظلم نہ ہو، اس پر ستم نہ ڈھائے جائیں، اس کی  
آزادی محبہ روح نہ کی جائے، اس پر ناروا پابندیاں نہ عاید ہوں۔ اس کی شخصیت اور  
ہستی زندگی، جنت کا نمونہ ہو، نہ کوئی فتنہ ہو، نہ کوئی اندیشہ! وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ  
انسان اب تک ”صید زبوں شہریاری“ ہے، تو تہیج اٹھتا ہے،  
نقشب ہے کہ انسان اور انسان کا شکاری ہے!

وہ اسے دیکھ نہیں سکتا کہ انسان ہوں اور غریب مساوی زندگی بسر کر رہے ہوں، انسان  
ہوں اور ان میں اوپنچ پنچ کی تفریق ہو، انسان ہوں اور کچھ فقر فلک بوس میں رہ  
رہے ہوں، اور بہت سے ایسے ہوں جنہیں سر چھپانے کو جھوٹی بھی میسر نہ ہو،  
وہ جب یہ عدم مساوات، یہ تفریق، یہ اونٹوں کا امتیاز، یہ تقسیم زر کا غیر عادلانہ  
اصول، یہ افارت اور غربت کی حد فاصل دیکھتا ہے تو اس کا دل بے قرار  
ہو جاتا ہے، اور اس کا نالہ، نالہ آتشیں بن جاتا ہے، پھر اس کے منہ سے شعر  
نہیں نکلتے، شرارے نکلتے ہیں، انگارے نکلتے ہیں، بھڑکتے ہوئے شعلے  
نکلتے ہیں۔



وہ اپنے وسیع علم، وسیع تجربہ اور وسیع فکر و تدبیر سے کام لے کر ایک راہ عمل سوچتا ہے، وہ منزل ڈھونڈتا ہے جو انسان کو جہنم سے جنت میں پہنچا دیتی ہو، جو انسانیت کی تمام مصیبتوں کا خاتمہ کر دیتی ہو۔ جو اس کے ہر روگ کو دور کر دے۔

سوچنے والوں نے، انسانیت کے آزار کا علاج یہ سوچا کہ اگر قیصریت کو فروغ ہو تو دنیا ہر دکھ سے آزاد ہو جائے گی بعض کو یہ الہام ہوا کہ اگر آمریت کا رواج دنیا میں ہو جائے، تو انسان دکھی نہیں ہے گا، بعض مفکروں پر یہ الفا ہوا کہ اگر جمہوریت کو فروغ ہو، تو دکھی انسان دعا کے لئے بھی ڈھونڈا جائے تو دستیاب نہ ہو سکے گا۔ بعض نبض شناسانِ زمانہ نے انسانیت کے مرض مزمن کا علاج یہ سوچا کہ اشتراکیت کا نسخہ استعمال کیا جائے، اسے استعمال کیا جائے، اسے استعمال کرتے ہی مرض کا فور ہو جائے گا، اور بیمار انسانیت تونند ہو کر بسمرگ سے اٹھ کھڑی ہوگی۔ انبال نے ان تمام تصورات و نظریات کو سوچا، جانچا، پرکھا، اور اپنے دماغ کے محل (لیبوریٹری) میں ان کا تجربہ اور تجزیہ کیا، اور اس نتیجہ پر پہنچا، کہ ان نسخوں میں کوئی بھی نسخہ ایسا تیر بہدف نہیں ہے کہ جلد امراض کو دور کر دے، حکمائے عصر کی متراہادیں، اور اطباء تھے حاذق کے صدری اور خاندانی نسخوں کی بھی اس نے خوب پڑتال کی، لیکن گو ہر مقصود کی تلاش میں وہ ناکام رہا۔

آخر ایک عرصہ کے غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ دنیا کے ہر روگ کا علاج "اسلام" ہے۔

اس کے علم نے، اس کی بصیرت نے اس کے تجربہ اور مشاہدہ نے اسے بتایا کہ

دنیا میں "قلبِ مسلمان" سے زیادہ حسین و جمیل کوئی چیز نہیں، "نگاہِ علم" سے زیادہ زلزلہ فگن، اور نفثِ شیرِ کمن کوئی مہنبار نہیں، ضربتِ خالد اور رورِ حیدر کا لازماً صرف "اسلام" ہے؛ لہذا کیوں نہ یہی نسخہ استعمال کیا جائے؟ کیوں نہ پھر اس کا تجربہ کیا جائے؟ کیوں نہ ایک بار اور یہ آزمائی ہوئی اکیس پھر آزمائی جائے؟ وہ تریاق جس سے جاں بلب اور لب گور، حیاتِ نو سے آشنا ہو لے۔ اور پھر جن کے لغو بکھیر سے دنیا بدل مٹھی جن کے زور بازو سے عالم لرز گیا۔ جن کے عدل و انصاف کی یہ مفتِ اقلیم گواہ ہے کیا وہ تریاق، آج کی بیمار و زار دنیا کے کام نہ آئے گا؟ کیا وہ نظریہ جو تجربہ کی پشت پناہی کے ساتھ اس سو برس سے آزمایا جا رہا ہے۔ ان نظریات کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکے گا، جو نوازیدہ ہیں، جن کی افادیت مشکوک ہے؟ جو اپنے روشن پہلو کے ساتھ تاریک پہلو بھی رکھتے ہیں؛ اور بعض اوقات جنہیں ایک دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہو جاتا ہے؟ یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر وہ اٹھا اور اس نے

عمری نوائے پریشان کو شاعری نہ سمجھ!

کی تہنیت کر کے، اپنا پیام، صلح و سلام کا پیام — دنیا کے نام دنیا شروع کر دیا۔ کیا تھا وہ پیام؟

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ دوست

اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

دنیا کے دوسرے فلسفیوں نے "ان ان اسے" (سو پرین) کے نظریے پیش کئے، لیکن وہ نظریہ کی حد سے آگے نہ بڑھ سکے، اقبال کا ان ان اسے (مردِ مسلمان) تاریخ کا دکھیا ہوا، نلوں کا پرکھا ہوا، صدیوں کا آزمایا ہوا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ فلسفی اپنے سو پرین کو اس حسن و خوبی، اس رعنائی و دلکشی، اس زیبائی اور شانِ جمال کے ساتھ نہ پیش کر سکے، جو اقبال کا حصہ ہے، اقبال کا مردِ مسلمان رازِ قدرتی ہے، جو دنیا میں براؤنگلنڈہ نقاب ہو کر اس لئے آیا ہے کہ دنیا کا ہر دکھ، اس کا ہر روگ اور اس کا ہر آزار دور کر دے!

بس! یہ ہے اقبال کا پیام، یہ ہے اس کی شاعری، یہ ہے اس مردِ قلندر کی "نوائے پریشاں" آج۔

---

# اقبال کا احتساب

## صرف ادبی نقطہ نظر سے

اقبال کا علمی پایہ، اور اُن کی فلسفیانہ حیثیت اور اُن کی شاعری کا مخصوص پیام اتنا بلند، انسان اور فخر و اعلاٰ اور اتنا متفق علیہ ہے کہ اس سے نہ سخن فہموں کو انکار ہے نہ سخن ناشناسوں کو، بلکہ اقبال کی یہ حیثیت اتنی مرعوب کن ہو چکی ہے کہ آپ کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جو شعر اقبال کا مفہوم و معنی بالکل نہیں سمجھیں گے، لیکن جھوٹ میں گے، سر و ضیق گے، رائے عامہ، کا اثر ایسا ہی ہوتا ہے، غالب کی عظمت مٹم ہے۔ اس کی عظمت اس کے ذہنی اور مشکل اشعار کی بنا پر نہیں ہے، مثلاً اہل نظر غالب کا شعر

شمار سجد مرعوب بیت مشکل پسند آیا

تماشا تے بیک کف بروں مدد دل پسند آیا

پڑھیں گے، اور گزند جائیں گے۔ لیکن جب اس کا کوئی وشہ نہ نظر سے گزرے گا جو سہل ممتنع کا حامل ہو، مثلاً

درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

تو واقعی و ذرِ کیف سے بے خود ہو جائیں گے، لیکن غالب سے مرعوبیت اس درجہ تک

پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی اس کا دقیق، شکل، گنجلک شعریں گے تو اس معرفت سے داد دیں گے، گویا ان پر چودہ طبق روشن ہو گئے ہیں، یہی کیفیت لوگوں کی کلام اقبال کے ساتھ ہے۔

لیکن اس گروہ عام سے ہٹ کر ایک گروہ بھی ہے، جو اقبال کی قابلیت و ذہانت کا معترف ہے، اس کی بلند پروازی، اور زبردست خیال کا ثنا خواں ہے۔ اس کی معمون آفرینی اور حسنِ ایلوب کا مداح ہے لیکن اس کی زبان ”کو غلط سمجھتا ہے! اس کے علم اور فلسفہ کا قائل ہے، لیکن اس کی ”ادبیت“ ”شائستہ التفات نہیں سمجھتا۔“ یہ وہ گروہ ہے، جو اپنے تیش، زبان کا امام، اور لغت کا ”خرو بے کلمہ“ سمجھتا ہے، وہ کہتا ہے

میں حقیر گدایانِ قوم را کیں قوم  
شہان بے کم و خسران بے کلام

یہ کامل پچاں اور زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہے، چشمِ فداں، اور خنجرِ نگاہ کا گھائل ہے، یہ عارضِ روشن اور ”تمثالِ حورِ مثال“ کا پجاری ہے جو اس کے ہم شرب ہوں، ان سے دُور بھاگتا ہے، جو جدت و نجدت کے قائل ہوں، جو فطرت کی گہرائیوں اور نبضِ انسانی کی دھڑکنوں کے محرمِ امران ہوں، یہ اپنی بولی کو چمن کی زبان سمجھتا ہے، اور دُوروں کی لڑائے پریشاں کو یہ شور و ہنگامہ سمجھتا ہے، یہ اپنی زبان کو کوثر کی دھلی ہوئی زبان سمجھتا ہے، اور دُوروں کی زبان اس کے نزدیک باہماعت ہے،

اس گروہ نے اقبال کی ادبیت اس کی زبانِ دانی، اور اشال و محاورات سے اس کی ناواقفیت کا نفاذ اس دور سے بجا یا کہ زبان و لغت کی دنیا وہل اٹھی، مخالفت

بے پناہ، مخالفت کا گردوغبار ایسا اٹھایا کہ اقبال کی ادبیت کا چہرہ روشن اس تاریکی میں چھپ گیا، اس کا رُوسے خوب، مخالفت کے غبار میں اوجھل ہو گیا اس کے ادبی صنائع و بدائع اس خوب اور ناخوب کی بحث میں، خنزف ریزوں سے بھی بدتر ہو گئے، وہ جو اہر تھے لیکن اُن کی تمیز اور پہچان مشکل ہو گئی۔

اقبال کی شاعری، اس کے پیام، اس کے فلسفہ اس کے نظریات سیاسی اور تفصیلات اسلامی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کے پیام، اور فلسفہ کے ان پہلوؤں کی ”رونائی“ اور ”نقاب کشائی“ عرصہ سے ہو رہی ہے، اس کی شاعری کے یہ وہ رُخ نہیں جن کا نظارہ دنیا عرصہ سے کر رہی ہے، اور نظارہ کرتے کرتے اُن کی ماہیت اور حقیقت سے بھی آشنا ہو چکی ہے۔

یوں تو اقبال کی شاعری ”کتاب دل“ کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کے متعلق خود اقبال کہہ چکے ہیں۔

”لکھی جائیں گی ”کتاب دل“ کی تفسیریں بہت!“  
چنانچہ اُن کے کلام کی شرح و تفسیر کا سلسلہ جاری ہے اور حیب تک آر دو زبان باقی ہے، نئے نئے پہلوؤں اور زاویوں سے اس کا سلسلہ جاری بھی ہے گا، ”مننوی مولوی معنوی“ اب تک تازہ ہے اور تا ابد تازہ رہے گی، اسی طرح اقبال کا کلام اب بھی تازہ ہے اور اس کی تازگی ہمیشہ قائم رہے گی۔

میرا خیال ہے کہ اقبال کی شاعری پر صرف ادبی نقطہ نظر سے اب تک بحث نہیں کی گئی ہے، اور یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ صرف اقبال کے ساتھ نہیں، بلکہ ادب کے ساتھ بھی، حقیقت یہ ہے کہ اگر لگا، غور سے دیکھا جائے تو اقبال کا ادبی پہلو بھی اتنا

درخشاں، آئنا تالیاں، آوازِ تنہا نظر فروز ہے کہ نہ اُسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے، نہ اُس کی جدت، تجدد، اور ادبی امتیاز کو فراموش کیا جاسکتا ہے، یہ وہ ہمیشہ ہیں جو منوں مٹی کے نیچے دبے ہوئے ہیں، مٹی کا ڈھیر بٹا دیا جائے۔ تو یہ نمایاں ہو جائیں گے، اور ان کی چمک دمک سے آنکھیں خستہ ہونے لگیں گی، جھوٹے موتی بھی آب دکھاتے اور چمکتے ہیں، لیکن سچے موتیوں کے سامنے ان کا پانی مرجاتا ہے، اور اُن کی آب ختم ہو جاتی ہے، اقبال کے سچے موتیوں کو اگر عصرِ حاضر کے جھوٹے موتیوں کے سامنے رکھا جائے تو فوراً نگاہ جو ہر شناس ناٹ لے گی کہ حقیقت کیا ہے اور کہاں ہے؟

صرف ادبی نقطہ نظر سے اگر اقبال کی شاعری کا احتساب کیا جائے تو بہت سے جواہر پارے ملیں گے جن کے متعلق ہرگز یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریڑھ کا ری ہے!

بلکہ جو اپنی آب و تاب اور چمک دمک کے اعتبار سے ”خالص“ کی چیمہ ہیں۔ اب ہم مختلف عنوانات کے ماتحت اقبال کی ادبی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں۔

## حقائق، محاورے، فلسفہ

اقبال زبانِ شعر میں حقائق و معارف بھی بیان کرتا ہے جنہیں ہم محسوس کرتے ہیں لیکن کہہ نہیں پاتے جن سے ہمارا دل آشنا ہے، لیکن زبان سے جن کی تفسیر نہیں کر سکتے۔ جو ہمارے سامنے گذرتے رہتے ہیں، لیکن ہم ان میں امتیاز نہیں کرتے، شاعر ان حقائق کو اس طرح، اس سادگی اور اس روانی سے بیان کرتا چلا جاتا ہے، گویا ایک معمولی بات کہہ دی، لیکن وہی معمولی سی بات جانِ سخن ہوتی ہے!



ہم آپ ہر روز موت کی کارندائیاں بے بسی کے ساتھ دیکھتے رہتے ہیں، دیکھتے ہیں اور رو لیتے ہیں، اور خاموش ہو جاتے ہیں، لیکن اقبال اس موت کی ہمہ گیری میں بھی "آرٹ" دیکھتا ہے، قدرت کے ذوق جستجو کو پالیتا ہے، وہ کہتا ہے، ہوا اگر جناب پیدا کرنے پر، دوبارہ اسے بنالینے پر قادر نہ ہو، تو جناب کو اتنی بے پردہائی سے مٹائی کیوں؟ قدرت، انسان کو فنا کر کے اسے حیاتِ نو سے نہ آشنا کر سکتی ہوتی، تو موت اتنی ارزاں اور سہل الحصول نہ ہوتی، اور اس غفلت سے قدرت کا مقصد کیا ہے؟ "خوب تر مخلوق" کی تخلیق فیلسفہ خود اقبال کی زبان حقیقت ترجمان سے صنیے :-

زندگی محبوب ایسی دیدہ قدرت میں ہے  
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے  
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات  
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات  
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں  
جس طرح سونے سے جینے میں غفل کچھ بھی نہیں  
آہِ اغافلِ موت کا ناز نہ ہاں کچھ اور ہے  
نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے  
جنتِ نظارہ ہے نقشِ ہوائے ہالائے آب  
موج مضطر توڑ کر کرتی ہے تعمیرِ حساب  
موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ  
کتنی بے دردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ

پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا  
 توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا  
 اس روش کا کیا اثر ہے ہیئتِ تعمیر پر  
 یہ تو حجت ہے ہوا کی قوتِ تعمیر پر  
 فطرت ہستی شہید آرزو رہتی نہ ہو  
 خوب ترسپیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

موت تجدید مذاقِ زندگی کا نام ہے  
 خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے  
 خوگر پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں  
 موت اس گلشن میں حبزِ سنجیدن پر کچھ نہیں

پردہ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح  
 داغِ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح  
 لالہِ افردہ کو آتشِ قبا کرتی ہے یہ  
 بے زباں طاثر کو مرستِ نوا کرتی ہے یہ  
 خفتگانِ لالہ زار و کدہار و رودبار  
 ہونے ہیں آخرِ عروسِ زندگی سے ہمکنار

یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح  
مرقد انسان کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

## مذہب

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر  
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ مہاشمی  
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار  
قوتِ مذہب نے استحکم ہے جمعیت تیری  
دامن دیں ماتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں  
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

## زندگی

تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ  
جادواں، پیہم دواں، ہر دم رواں ہے زندگی  
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے  
سزا آدم ہے ضمیمہ کن نکال ہے زندگی  
زندگانی کی حقیقت کو کہن کے دل سے پوچھ  
جوئے شیر و تیشہ سنگ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جو مکمل آب  
اور آزادی میں کربے کراں ہے زندگی

## طلوع اسلام

کتابِ ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے  
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا  
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے  
جڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا  
نور پیرا ہواے بیکل کہ ہو تیکر تر غم سے  
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کاجگر پیدا کر  
ترے سینے میں ہے پوشیدہ راز زندگی کہدے  
مسلمان سے حدیث سوز و ساز زندگی کہدے

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونیوالا ہے  
نشکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطقِ عربی  
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بیکل  
دورِ تلخ ترمی زن چو ذوقِ نعمت کمیابی  
مڑپ صحنِ چمن میں، آشاں میں شاخساروں میں  
جدا پارے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیما بی

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کبے  
چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کرے

## درس، پیام، خطاب

اقبال کی شاعری کا ایک خاص جزو یہ بھی ہے کہ اس میں سبق بھی ملتا ہے  
اور پیام بھی، وہ دعوتِ نظر بھی دیتے ہیں اور دعوتِ الہاب بھی، وہ پیامِ درد بھی  
دیتے ہیں، اور لذتِ حرام بھی،

یہ درس ان کے ہاں نثر اور موہ لینے والے الفاظ میں ملتا ہے کہ  
وہ کہیں اور ناکرے کوئی!

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر  
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی  
جیسا وہ کیا جو ہونفسِ عینِ پر مدار  
شہرت کی زندگی کا بھروسہ بھی چھوڑ دے

شام جس کی آشنائے نالہ "یارب" نہیں  
جلو پیلا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں  
جس کا جامِ دلِ نکستِ غم سے ہے نا آشنا  
جو دستِ شبابِ عیش و عشرت ہی رہا

مانتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوک خار سے  
 عشق جس کا بنے خبر ہے عجب ر کے آزار سے  
 کلفت غم گر چہ اس کے روز و شب سو دور ہے  
 زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

---

وطن کے متعلق کہتے ہیں ۱۔

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی  
 رہ کر میں آزاد وطن صورتِ ماہی

---

حسن ازل ہو پیدا تاروں کی دبیری میں  
 جس طرح عکس گل ہو شبہم کی آرسی میں  
 آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا !  
 منزل یہی کشن ہے قوموں کی زندگی میں  
 یہ کاروان ہستی ہے نیم گام آیا  
 تو میں کچل گئی ہیں جس کی روا روی میں  
 میں جذب باہمی سے قائم نظام سارے  
 پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

---

## ہلالِ عیسٰی کے خطاب

اوج گردوں سے ذرا دُنیا کی بستی دیکھ لے  
 اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے  
 قافلے دیکھ اور اُن کی برقی رفتاری بھی دیکھ  
 رہو در ماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ  
 دیکھ کر تنجوانق پر ہم ٹاٹتے تھے گھر  
 اے تھی ساغرِ ہماری آج ناداری بھی دیکھ  
 فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم امیر  
 اپنی آزادی بھی دیکھ اُن کی گرفتاری بھی دیکھ  
 دیکھ مسجد میں شکتِ رشۃً تسبیح شیخ  
 متبلکہ ہیں برہمن کی بچتہ زناری بھی دیکھ  
 کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر  
 اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ  
 ہاں تملقِ پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو  
 اور جو بے آبرو تھے اُن کی خودداری بھی دیکھ  
 جس کو ہم نے آشنا لطف و تکلم سے کیا  
 اس حریفِ بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ



مشہور نظم ”شمع و شاعر“ کا ایک حصہ،  
 شمع شاعر سے کہتی ہے:-

میں تو جلتی ہوں کہ بیٹھے مرمی فطرت میں سوز  
 تو نہ سزاں ہے کہ پر والوں کو ہوسودا ترا  
 گر یہ سماں میں کہ میرے دل میں ہو طوفان آشک  
 شبہم افشاں تو کہ بزم گل میں ہو چہ چا ترا  
 یوں تو روشن ہے مگر سوز دروں رکھتا نہیں  
 شعلہ ہے شبل چہ راغ لالہ صحرارا ترا  
 قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں  
 تنگ ہے صحرانا محمل ہے بے لیل ترا  
 اب نو اسپاہے کیا گلشن ہما پر ہم ترا  
 بے محل تیرا ترنم نغمہ بے موسم ترا  
 کھا جہنیں ذوق تماشا وہ تو رخصت ہو گئے  
 لے کے اب تو وعدہ دیدار عام آیا تو کیا  
 آہ جب گلشن کی جمیعت پریشاں ہو چکی  
 پھول کو باد بہاری کا پیام آیا تو کیا  
 آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ  
 صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

واسے ناکامی مستلح کارواں جاتا رہا  
 کارواں کے دل سے احساسِ زباں جاتا رہا  
 جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی  
 شہرِ آن کے مٹ گئے آبادیاں بن ہو گئیں  
 سطوتِ توحیدِ قائم جن نمازوں سے ہوتی  
 وہ نمازیں بہند میں نذرِ بربہمن ہو گئیں  
 شامِ غم لیکن خبرِ دیتی ہے صبحِ عید کی  
 ظلمتِ شب میں نظرِ آئی کرنِ امید کی  
 مشرودہ اے پیمانہ بردارِ خستہ تانِ حجاز  
 بعدِ مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہوش  
 پھر یہ غوغا ہے کہ لاسانی شرابِ خلہ ساز  
 دل کے ہنگامے میں مغرب نے کڑا لے خوش

---

رہزن بہت ہوا ذوقِ تن آسانی ترا  
 بھر تو اے صحرا میں تو گلشن میں مثل جو ہوا  
 اپنی اصلیت پر قائم تھا تو جمعیت بھی تھی  
 چھوڑ کر گل کو پریشاں کارواں بو ہوا  
 زندگیِ قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات  
 یہ کبھی گویا، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی  
 جب یہ جمعیت گئی مرنیا میں رسوا تو ہوا  
 فرد فاکم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں  
 موج ہے دریا میں اور بیروں دریا کچھ نہیں  
 کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں  
 ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر  
 اس چین میں پیرو بلبل ہو یا تلمیذ گل  
 یا سراپا نالہ بن جا یا نور پیار نہ کر  
 آشنا اپنی حقیقت سے ہوائے دہشتاں ذرا  
 دانہ تو کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو  
 آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے  
 راہ تو، رہرو بھی تو، مہرب بھی تو، منزل بھی تو  
 کانپتا ہے دل تڑا اندیشہ طوفاں سے کیا  
 ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو  
 دیکھ آکر کوچہ چپاک گریباں میں کبھی!  
 قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو  
 وائے نادانی کہ تو محتاج ساتی ہو گیا  
 مے بھی تو، مینا بھی تو، ساتی بھی تو، محفل بھی تو

بے خبر تو جو ہر آئینہ آیام ہے  
 تو زمانہ میں خدا کا آخری پیغام ہے  
 اپنی اہلیت سے ہوا نگاہ لے ناداں کہ تو  
 قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے  
 کیوں گرفتار ظلم، ہیچ معذاری ہے تو  
 دیکھ تو پر شیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے  
 سینہ ہے تیرا ایس اُس کے پیام ناز کا  
 جو نظامِ دہر میں پیدا ہوئی ہے پنہاں بھی ہے  
 ہفت کشور جس سے ہو تجھ کے توپ و تفنگ  
 اے تغافلِ پیشہ تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے؟  
 تو ہی ناداں چپند کلیوں پر فغاوت کر گیا  
 در نہ نگلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

---

آسماں ہو گا محکے نور سے آئینہ پوشش  
 اور ظلمتِ رات کی سیماں پا ہو جائے گی  
 آملیں گے سینہ چاکاں چین سے سینہ چاک  
 بزمِ گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی  
 پھر جبیں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود  
 پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

ناتہ صیاد سے ہوں گے نواساں طیور  
 خون گلیچیں سے کئی زنجیں تبا ہو جائے گی  
 آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں  
 محو حیرت ہوں کہ دنیا کیلے کیا ہو جائے گی  
 شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ عور شید سے  
 یہ چین مسموم ہوگا لغتِ توحید سے

نمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں !  
 تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی غور لے

اگر منظور ہو تجب کو خزاں نا آشنارہنا  
 جہاں رنگ و بو سے پہلے قطع آرزو کر لے

نری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ  
 کہ ہمیشہ نان شعیر پر ہے ملار، قوتِ جیدری

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر بت میں گم ہو جا  
 نہ نورانی ہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی !

گماں آباد ہستی میں یقین مرد مسلمان کا  
 بیاباں کی شب تاریک میں قندیل مہربانی  
 مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے  
 وہ کیا تھا؟ زور حیدر فقر بود صدق سلمان  
 جب اس الگ کارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا  
 تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الہی پیدا  
 ٹھوکر

اقبال اپنے اشار سے نیند کے مانوں کو ٹھوکر بھی لگاتا ہے کہ وہ بیدار ہوں،  
 ہر شیاء ہوں، اٹھیں اور اپنے احساس عمل کی دنیا آباد کر ڈالیں۔ کہتا ہے:-  
 بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا  
 چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

---

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے  
 کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جلتے ہیں سفینوں میں

---

تعلیق کی روش سے تو بہت دیر سے خود کشی  
 رستہ بھی ڈھونڈھ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے  
 اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے  
 واعظ ثبوت لائے جوے کے جواز میں  
 اقبال کو یہ خُدا ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

---

یہ رسم بزم فنا ہے اے دلِ گناہ ہے جنبشِ نظر بھی  
 رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہو گا

---

تیرے آبا کی اگر مجبلی تھی جس کے واسطے  
 ہے وہی باطل ترے کاشانہِ دل میں لکیں

---

نہیں یہ شانِ خود داری چسمن سے توڑ کر تجھ کو  
 کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے

---

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ  
 خاک و خوں میں بل رہا ہے نریمانِ سختِ کوش  
 آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے  
 کیا کسی کو پھر کسی کا امتحانِ مقصود ہے



ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ  
 پہلے اپنے پیکر خاکی میں جہاں پیدا کرے  
 پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار  
 اور خاک ترے آپ اپنا جہاں پیدا کرے  
 زندگی کی قوت پہنچاں کو کر دے آتش کار  
 تا یہ چنگاری منسروغ جاوداں پیدا کرے  
 خاک مشرق پر چمک جائے مثال آفتاب  
 تا بدخشاں پھر وہی لعل و گراں پیدا کرے  
 سوئے گردوں نالہ شبگیر کا بھیجے سفیر  
 رات کے تاروں میں اپنے راز داں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے نوعِ صمدِ محشر میں ہے  
 بیشِ گر غافل اگر کوئی عملِ دستر میں ہے

---

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ  
 "نخواجگی" نے خوب چن چن کے بنائے مسکوت  
 کٹ مرا تا داں خیالی دیوتاؤں کے لئے  
 سکھ کی لذت میں تو لٹا گیا نفتِ حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سٹیہ دار  
 انتہائے سادگی سے کہا گیا مزدور ماست  
 اُٹھ کہ اب بنرم جہاں کا اور ہی انداز ہے  
 مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

---

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول  
 غنچہ سال غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک؟  
 نغمہ بیداری جھڑپ ہے سامانِ غیش  
 قصہ خواب آور اسکندر و جم کب تلک؟  
 آفتاب تازہ پیدابطن گیتی سے ہوا  
 آسمان ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟  
 باغبان چہارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار  
 زخمِ گل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک؟  
 کریم ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو  
 اپنی فطرت کے نخلی زار میں آباد ہو

---

پرے سے چرخ نیلی فام سے منزل مسماں کی  
 سنا سے جس کی گروہ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے  
 حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیا  
 تری نسبت برہمی ہے معمار جہاں تو ہے  
 جہاں آب و گل سے عالم حب وید کی خاطر  
 نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغان تو ہے  
 یہ نکتہ سرگزشت ملت بیضا سے ہے پیدا  
 کہ اقوام زمیں ایشیا کا پاسباں تو ہے  
 سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا  
 لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

---

ہوئے مدفون دریا زیر دریا تیرے والے  
 طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر بن گئے  
 غبار رگدڑ ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو  
 جمینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اکیر گر بن گئے  
 ہمارا نرم روتا صد پیغام زندگی لایا  
 خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر بن گئے

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے  
 جو انان تناری کس قدر صاحبِ نظر نیکے  
 زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز رکھتے تھے  
 یہ خاکی زندہ تر، پائیدہ تر، تابندہ تر نیکے  
 جہاں میں اہل ایماں صورتِ غور شید جلیئے ہیں  
 ادھر ڈوبے، ادھر نکلے، ادھر ڈوبے، ادھر نکلے

یقیناً اسرارِ کاسرِ پائے تعمیر ملت ہے  
 یہی قوت ہے جو صورتِ گر تقدیر ملت ہے

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا  
 خودی کا رازِ داں ہو جا، خدا کا تر جہاں ہو جا  
 ہوس نے کر دیا ہے کڑے کڑے نفعِ انساں کو  
 اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا  
 یہ ہندی وہ حسدِ آسانی، یہ افغانی وہ توہراتی  
 تولے شرمندہ ساحلِ اچھل کر بے کراں ہو جا  
 مصافِ زندگی میں سیرتِ فولادِ پیما کر  
 شبتانِ محبت میں سرِ پرو پر نیاں ہو جا  
 گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہِ بیاہاں سے  
 گلستانِ راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

بے خطر کو دھڑا آتش نرود میں عشق  
عقل ہے محو تماشا سے لب بام ابھی

لاہور میں ایک مرتبہ، رات بھر کے اندر اندر سرکاری زمین پر بے اجازت  
مسلمانوں نے مسجد تعمیر کر کے کھڑی کر دی، وہ مسجد بعد میں بڑھادی گئی۔ اس واقعہ  
پر اقبال نے کہا:-

مسجد نو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے  
من اپنا چرانا پانی ہے برسوں میں منازی بن نہ سکا  
تر آنکھیں تو ہوجاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں  
جب خون جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا  
اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں وہ لیستا ہے  
گفتار کا یہ غازی تو بن کر دار کا غازی بن نہ سکا

## فکر مسلسل

اقبال کے کلام میں ایسی مسلسل اور مربوط نظمیں بھی ملتی ہیں، جو اپنی جدت تشبیہ  
حسن بیان، خوبی ادا، ندرت خیال، بلند فکری فکر اور وضع اسلوب کے اعتبار سے نہ  
صرف اردو زبان میں بلکہ دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان میں مایہ ناز کہی جاسکتی ہیں۔  
ایسی نظموں کو کڑے کڑے کر کے مختلف عنوانات کے ماتحت ان کے صنائع و بدائع

پر گفتگو کرنا، اُن کے لطف اور کیف کو کم کر دے گا۔ اس لئے ہم، ایسی چند نظموں کو  
مختصراً پیش کرتے ہیں

۔ ایک آرزو کے عنوان سے اقبال نے ایک مصرعہ آرا نظم کہی ہے، اس کی زبان  
انداز بیان تشبیہات و استعارات، فکر و خیال کا اسلوب ہر چہ دامنِ دل کو اپنی  
طرف کھینچتی ہے۔

کرشمہ دامنِ دلِ می کشد کہ جا اینجاست !  
نظم ملاحظہ ہو :-

دُنیا کی محفلوں سے اُتک گیا ہوں یا رب  
کیا لطفِ اجمن کا جب دل ہی مجھ گیا ہو  
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا  
ایسا سکوت جس پر تقیر بھی ف را ہو  
مرتزا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری  
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو  
آزادِ فکر سے ہوں، عزت میں دن گذاروں  
دُنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو  
لذتِ سرود کی ہوجپٹیوں کے چھیچھے میں  
چشمے کی شورشوں میں باجِ سانج رہا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا  
 ساغر و ذرا سا گویا مجھ کو جہاں منا ہو  
 ہو ہاتھ کا سر ہانڈا، سبزہ کا ہونچھونا  
 شراب جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو  
 مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبلی  
 ننھے سے دل میں اسکے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو  
 صف مانند ہے دونوں جانب بوٹے سے ہے ہر ہوا  
 ندی کا صاف پانی لفظیہ لے رہا ہو  
 ہو دلفریب ایسا کہار کا نظارہ  
 پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو  
 آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ  
 پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چپک رہا ہو  
 پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی  
 جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو  
 مہندی لگائے سُدج جب خام کی دِلہن کو  
 سُرخ لے سنہری ہر پھول کی تبا ہو  
 راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جسم  
 اُمید آن کی میسر ٹوٹا ہوا دیا ہو



بجلی چمک کے اُن کو گُٹیا مری دکھائے  
 جب آسمان پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو  
 پچھلے پہر کی کوتل وہ صبح کی موذن  
 میں اس کا ہسم نوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو  
 کانوں پہ ہو دھیسک دیر و حرم کا احساں،  
 روزن ہی جھنڈ پٹری کا مجھ کو سحرنا ہو  
 چھوٹوں کو آئے جہدم شبنم وضو کرانے  
 رونا مراد وضو ہونا نہ مری دعا ہو  
 اسی خامشی میں جاتیں اتنے بلند نالے  
 تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو  
 ہر درد مند دل کو رونا مارا ملا دے  
 بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

”ماہ نو“ کے عنوان سے ایک نظم میں اقبال نے، وہ ادبی موتی بکھیرے  
 ہیں، وہ نئی نئی باتیں کہی ہیں، وہ نادر اور بے مثل تشبیہیں اور ہتھارے ہتھال کئے  
 ہیں کہ بے ساختہ صدائے واہ وادیں کی آغوش سے بلند ہوتی ہے۔  
 ”ماہ نو“ کو دیکھ کر اقبال کہتے ہیں :-

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوتی غرقاب نیل  
 ایک مکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل

طشت گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خون ناب  
 نشرِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصد آفتاب  
 چرخ نے بالی چسپالی ہے عروس شام کی؟  
 نیل کے پانی میں یا پھلی ہے سیم خام کی؟  
 ”فصد آفتاب“ دو کشتی غور شید“ ”طشت گردوں“ ”شفق کا خون ناب“  
 ”عروس شام کی بالی“ ”سیم خام کی پھلی“ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی مثال اردو ادب  
 میں ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی۔

---

”ماہ نو“ کی روشنی آپ دیکھ چکے، اب ذرا جگنو کی چمک دیکھیے، اور دیکھیے کہ  
 اک رنگ کا مضمون ہو تو سوطح سے باز ہوں  
 کو اقبال کس طرح ثابت کر کے دکھاتا ہے:-

جگنو کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں  
 یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی اجسن میں؟  
 آیا ہے آسماں سے آسماں سحر کر کوئی ستارہ  
 یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں؟  
 یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا  
 غربت میں آ کے چمکا گنام تھا وطن میں  
 مکہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا  
 ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیہن کا؟

حُسنِ تدبیر کی پوشیدہ اک جھلک نفی  
 لے آتی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں  
 چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی  
 بکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں  
 پروانہ اک پننگا جب گنو بھی اک پننگا  
 وہ روشنی کا طالب یہ روشنی سراپا

---

”محبت کے عنوان سے اقبال نے ایک نظم کہی ہے۔ یہ نظم نہیں اسرار و معارف  
 کا مرقع ہے۔ یہ نظم کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:-

سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا  
 صفا تھی جس کی خاک پا میں بڑھ کر ساغرِ جم سے  
 لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اسیر کا نسخہ  
 چھپانے تھے فرشتے جس کو چشمِ روح آدم سے  
 نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیا گر کی  
 وہ اس نسخہ کو بڑھ کر جب ناتھا اہم اعظم سے  
 بڑھا تب سحرِ خوانی کے بہانے عرش کی جانب  
 تہمتاے ولی آخر برائی سعی پیہم سے  
 پھر ایا فکرِ جزائے اسے میدانِ امکاں میں  
 چھپے گی کیا کوئی شے ہار گاہ حق کے محرم سے

چمکتا رہے سے مانگی چاند سے درخ جگر مانگا  
 اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے  
 ٹیڑھ پہلی سے پائی، سحر سے پاکیزگی پائی  
 حرارت لی نفس ہائے یسوح ابن مریم سے  
 ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی  
 ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے  
 پھر ان اجزا کو گھولا چشمہ عیواں کے پانی سے  
 مرکب نے محبت نام پایا عرشِ عظم سے

ایک زمانہ تھا کہ عرب حقیقہً رسی، کے فرماں روا تھے، وہاں کی مسجدوں سے  
 نعرۂ تکبیر بلند ہوتا تھا۔ وہاں کی خانقاہوں سے قال اللہ کے ترانے گونجتے تھے۔ وہاں  
 کے مکاتب اور مدارس سے قال الرسول کے ارشادات سنائی دیتے تھے، مسلمان جہاں  
 گئے، انہوں نے اپنی انفرادیت باقی رکھی۔ رسی میں بھی یہی ہوا۔  
 پھر عربوں کی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ ان کی تہذیب و تمدن کے آثار فنا ہو  
 گئے۔ ان کے مدارس، ان کے مکاتب، ان کے دارالعلوم، ان کی مسجدیں، ان کی خانقاہیں  
 ویران ہو گئیں۔

اقبال یورپ جلتے ہوئے، ادھر سے گزرے، یہ جزیرہ اہل جہاز کو دُور  
 سے نظر آنے لگتا ہے، اقبال نے اُسے دیکھا، اور اس کی نگاہوں کے سامنے، ایام،  
 ایام سلف کی تاریخ پھر گئی۔

اپنے تصور اور تاثر کو اُس نے نظم کا جامہ پہنایا، الفاظ کی تراش و تراش  
مضمون کی اثر آفرینی، خیال کی رفعت، بیان کا سوز، ہر چیز اپنی جگہ داد طلب ہے  
چند اشعار دیکھئے :-

رو لے آبِ دل کھول کر اے ویدہ خوننا بہ بار  
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حبازی کا مزار  
تھا یہاں ہنگامہ ان صحبِ انشینیوں کا کبھی  
بحرِ بازی گاہِ نفا جن کے سفینوں کا کبھی  
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے  
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

---

آہ اے سہلی سمندر کی ہے کچھ سے آبرو  
رہنا کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو  
زلزلتِ تیرے خال سے رخسارِ دریا کو ہے  
تیری شمعوں سے نئی بجس پیا کو رہے

---

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستان ؟  
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں  
دردِ اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں  
جس کی تو منزل تھا میں اس کا رواں کی گرد ہوں

زنگِ تصویر کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے  
 قصۂ ایامِ سلف کا کہہ کے ترپا دے مجھے  
 میں نہ اٹھ سوتے ہندوستان لے جاؤں گا  
 خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا

”رات“ شاعر سے کہتی ہے۔  
 کیوں مبیہ بی چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں  
 خاموش صورتِ گل، مانسہ بو پریشاں  
 تاروں کے موتیوں کا شاید سہ ہے جو ہری تو  
 مچھلی ہے کوئی میرے دریائے نور کی تو  
 یا تو مری جبیں کا مارا گرا ہوا ہے  
 رفعت کو چھوڑ کر جو پستی میں جا رہا ہے  
 خاموش ہو گیا ہے تار بابا ہستی  
 ہے میکے آئینے میں تصویرِ خواب سہتی  
 دریا کی تہ چشمِ گداز سو گئی ہے  
 ساحل سے لگ کے موجِ بے تاب سو گئی ہے  
 بستی زمیں کی کیسی بھگتا مہ آفریں ہے  
 یوں سو گئی ہے، جیسے آباد ہی نہیں ہے

شاعر کا دل ہے لیکن نا آشت ناسکوں سے  
آزاد رہ گیا تو کیونکر مرے منوں سے ؟

شاعر جواب دینا ہے :-

میں ترے چاند کی کھینچی میں گہر ہوتا ہوں  
چھپ کے ان لوں سے مانند سحر روتا ہوں  
دن کی شورش میں نکلے ہوئے ثمراتے ہیں  
عزت شب میں مرے اشک ٹپک جاتے ہیں  
برق امین مرے سینہ پہ پڑی سوتی ہے  
دیکھنے والی ہے جو آنکھ کہاں سوتی ہے

## اسرار و رموز !

زندگی کے اسرار، اور اس عالم خاکی کے رموز بھی اقبال بیان کرتے ہیں ،  
پیرایہ بیان ایسا ہوتا ہے کہ راز راز رہتا ہے ، لیکن ایک سوال بن کر ، کچھ سلجھ بھی جاتا ہے  
اس میں کچھ سوچ اور زندگی بھی پیدا ہو جاتی ہے ، اس کا رنگ کچھ اور بکھر جاتا ہے :-  
کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انسان !

کہاں جاتا ہے آ جاتا ہے کہاں سے  
وہیں سے رات کو طلعت بلی ہے  
چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے



گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر!  
 شمع بولی گریںم کے سوا کچھ بھی نہیں

جو موج دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان میری  
 گہریہ بولا صدف نشینی ہے محب کو سامان آبرو کا  
 نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے  
 ہوانہ سر سبز رہ کے پانی میں عکس سرو کنار جو  
 کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا  
 الہی تیرا جہان کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا

### موٹر

ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خدام ناز  
 مانند برق تیز مثال ہوا خموش  
 میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر  
 ہے جاوہ حیات میں تیریں باخموش  
 ہے پائنتہ شہود فزاید سے جس  
 نگہت کا کارواں ہے مثال صبا خموش

میں نام دم شورش قفل سے پاہگل  
لیکن مزاج جام خام آشنا خوش

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل  
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

## فلسفہ ہست و بود

اقبال نے اپنی شاعری میں فلسفہ ہست و بود پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور حق یہ ہے کہ اس میدان میں اس کا خرس فلک سیر خبتنا نیز جاتا ہے کوئی بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، اور کمال یہ ہے کہ یہ فلسفہ بیان کرتے ہوئے بھی وہ رنگین نواہی، اور خوش بیانی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔

”جگنو“ کی جی بھر کے تعریف کرنے کے بعد، وہ فلسفہ بیان کرتا ہے سینے اور گل و بلبل کی زبان سے سینے :-

ہر چہ ز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی  
پروانہ کو تپش دی جس گنو کو روشنی دی  
زنگین لڑا بنا یا مرغان بے زباں کو  
گل کو زبان دے کر تسلیم خاشی دی  
زنگین کیا سحر کو بانگی دلہن کی صورت  
پہنا کے لال جوڑا شبہم کو آرسی دی

سایہ دیا شجرہ کو ، پرواز دی ہوا کو  
 پانی کو دی روانی موجوں کو بے کلی دی  
 یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری  
 جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری  
 حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے  
 انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چمک ہے  
 یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا  
 واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کس ہے  
 انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ  
 نغمہ ہے توئے بکبل ، بو پھول کی چہک ہے  
 کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی  
 جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

”میں اور تو“ کے عنوان سے ایک نظم !  
 مذاق دید سے نا آشتی نظر ہے مری  
 تری نگاہ ہے فطرت کی راز داں پھر کیا ؟  
 رہیں شکوۂ آیام ہے زباں میسری  
 تری مراد پہ ہے دور آسماں بھیر کیا ؟

فزول ہے سود سے مرایہ حیات ترا  
 مے لعیب میں ہے کاوش زیاں پھر کیا؟  
 رکھا مجھ چمن آوارہ مثل موج نسیم  
 عطا فک نے کیا تجکو اشیاء پھر کیا؟  
 ہوا میں تیرے پھرتے ہیں ترے طیارے  
 مہاجاز ہے محسوس باد باں پھر کیا؟

قوی شدید چہ شد؟ ناتواں شدید چہ شد؟  
 چنیں شدید چہ شد با چناں شدید چہ شد؟  
 بہ بیچ گور دریں گلستان تار نیست  
 تو گر بہار شدی، ما خنداں شدید چہ شد؟

## بیور

انبال کے کلام میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو اپنے تیور کے اعتبار سے ایک  
 خاص مقام رکھتے ہیں جن کے الفاظ گرجتے ہیں، اکڑتے ہیں، مثلاً  
 میں طلست شب میں لے کے مکلوں کا اپنے در ماندہ کارواں کو  
 شرفشاں ہو گی آہ میسری نفس مرا شعلہ بار ہو گا

مشہور نظم ”شکوہ“ کے چند بند :-

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی !

اہل چیں، چتین میں ایران میں ساسانی بھی

اسی مہمورے میں آباد تھے یونانی بھی

اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے

بات جو بڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے

تھے ہمیں ایک ترے مکر آراؤں میں

خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں

وہیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں

کبھی افریقہ کے پتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ چھپتی تھی جہانداروں کی

کلمہ پڑھتے تھے ہمیں چچاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کیلئے

آدرمر نے تھے ترے نام کی عظمت کے لئے

تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لئے

سرکھن بھپتے تھے کیا دہر میں دولت کیلئے؟

قوم اپنی جو زر و مال جہاں پر مرقی

بہت فروشی کے عوض بہت شکنجہ کیوں کرتی؟

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں لڑ جاتے تھے  
 پاؤں شیروں کے بھی میدان سوا کھڑ جاتے تھے  
 تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے  
 نینغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے  
 نقشِ توحید کا ہر دل پہ بٹھا یا ہم نے  
 زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے  
 تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے؟  
 شہرِ قیصر کا جو تھا اُس کو کیا سر کس نے؟  
 توڑے مخلوقِ خداوندوں کے پیکر کس نے؟  
 کاٹ کو رکھ دیئے کفار کے لشکر کس نے؟  
 کس نے ٹھنڈا کیا آتشِ کدہِ ایریاں کو؟  
 کس نے پھر زندہ کیا تذکرہِ یزداں کو؟  
 آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز  
 قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز  
 ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز  
 نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز  
 بندہ صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے  
 نیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

مخل کون و مکاں میں بحر و شام کر دے  
 مئے توحید کو لے کر صفت حجام پھرے  
 کوہ میں دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے  
 اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے  
 دشت تو دشت میں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے  
 بحرِ ظلمات میں دُور اسیٹے گھوڑے ہم نے

”در جواب شکوہ“ کے چند بند !

خدا سے شاعر نے شکوہ کیا تھا، اب عرش الہی سے اس کا جواب ملتا

ہے :-

جاگے ہوئے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب  
 زحمت روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب  
 نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب  
 پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب  
 امرائے دولت میں ہیں غافل ہم سے  
 زندہ ہے ملتِ بیضنا غزا کے دم سے  
 واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی  
 برقِ طبعی نہ رہی شعلہِ مقالی نہ رہی



رہ گئی رسمِ اذان رُوحِ بلالی نہ رہی  
 فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی  
 مسجدیں مریخِ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے  
 یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے  
 شور ہے ہو گئے دُنیا سے مسلمان ناہود  
 ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود  
 وضع میں تم ہو نصاریٰ تو متدن میں ہنود  
 یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کے شراباٹیں یہود  
 یوں تو سبید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو  
 تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو  
 تم ہو آپس میں غضبناک وہ آپس میں حیم  
 تم خطا کار و خطا ہیں وہ خطا پوش و کریم  
 چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم  
 پہلے آیا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم  
 تختِ مغفور بھی ان کا تھا سریر کئے بھی  
 یوں ہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی  
 خود کشی شیدہ مہتہارا وہ عبورِ خود دار  
 تم اخوت سے گریزاں وہ اخوت پہ نثار

نم ہو گفتار سراپا وہ سراپا کردار  
 نم ترستے ہو کلی کو وہ گلستاں بہ کنار  
 اب تلک یا رہے قوموں کو حکایت اُن کی  
 نقش ہے صفحہ ہستی پر صداقت اُن کی  
 تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے  
 نشہ مے کو تعلق نہیں مے خانہ سے  
 ہے عیاں شورش تاتار کے افسانے سے  
 پاسباں بل گئے کعبہ کو منم خانہ سے  
 کشتی حق کا زمانے میں سہارا تو ہے  
 عصر فورات ہے، دھندلا سا تارہ لچھے

## سوال و متفسار؟

جوش کلام میں جب شاعر، کوئی سوال کرتا ہے یا کسی سے متفسار کرتا ہے  
 تو اس کے کلام میں ایک خاص بانگ بین، ایک خاص تسلسل پیدا ہو جاتا ہے "خفتگان خاک"  
 سے وہ متفسار کرتا ہے:-

اے مئے غفلت کے مستو کہاں رہتے ہو تم؟  
 کچھ کہو اس دیس کی آہِ رجاں رہتے ہو تم؟

وہ بھی حیرتِ خانہ امروز وں رہا ہے کوئی  
 اور پیکارِ عناصر کا متا شاب ہے کوئی؟  
 آدمی رواں بھی حصارِ نسیم میں ہے محصور کیا؟  
 اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا؟  
 واں بھی جل مرتا ہے سوڑ شمع پر یہ واں کیا؟  
 اس چین میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا؟  
 باں نواں مصرع میں پہلو سے نکل جاتا ہے دل  
 شمع کی گرمی سے کیا واں بھی پگھل جاتا ہے دل؟  
 کیا دہاں بجلی بھی ہے؟ غمزن بھی ہے؟ دہقان بھی ہے؟  
 فانیلے والے بھی ہیں اندیشہ رنرن بھی ہے؟  
 تنکے چنتے ہیں دہاں بھی آشتیاں کے واسطے؟  
 خشت و گل کی منکر ہوتی ہے مکاں کے واسطے؟  
 واں بھی انساں اپنی اہلیت سے بیکانے ہیں کیا  
 امتیازِ وقت و آئین کے دلہانے ہیں کیا؟  
 واں بھی کیا نسر یادِ بلبل پر چین رونا نہیں؟  
 اس جہاں کی طرح واں بھی دردِ دل ہوتا نہیں؟

---

## حَسَن اور محبت

حَسَن، محبت، عشق، یہ خاص اصطلاحیں ہیں، اور انہیں بالکل دوسرے معنوں میں اقبال نے استعمال کیا ہے، لیکن ان اصطلاحوں سے قطع نظر کر کے عام، اور متداول معنوں میں انہیں محدود کر کے دیکھئے، تو بھی اقبال نے انہیں جس طرح استعمال کیا ہے، وہ انہی کا حصہ ہے:-

بیابان محبت دشتِ غربت بھی وطن بھی ہے  
یہ ویرانہ نفس بھی اشیاء بھی چمن بھی ہے  
محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہر صحرا بھی  
جس بھی کارواں بھی، رہبر بھی، راہزن بھی ہے  
مرض کہتے ہیں سب اس کو یہ ہے لیکن مرض آیا  
چھپا بس میں علاج گردشِ چرخ کہن بھی ہے  
وہی اک حَسَن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں  
یہ شیریں بھی ہے گویا، بے سنتوں، کو کہن بھی ہے  
ایک مسلسل نظم کا ایک ٹکڑا:-

شیشہ دہریں مانند مئے ناب ہے عشق  
رُوحِ خورشید ہے، خوںِ رگ مہتاب ہے عشق  
دل ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے کس ہے اس کی  
نوریہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی

کہیں سامانِ مسترت کہیں ساز غم ہے  
کہیں گورہے کہیں اشک کہیں شبنم ہے

## لذت درو!

دُنیا میں کون ہے جو دردِ آستانہ ہو؟ جسے ناکامیوں اور نامرادیوں سے سابقہ  
نہ پڑا ہو؟ جس نے زمانہ کی ٹھوکریں نہ کھائی ہوں؟ جس نے تباہی و بربادی کے بحرِ طوفانِ  
میں بچکولے نہ کھائے ہوں؟ جو تجرُّدِ فراق کی مصیبت سے آستانہ نہ ہوا ہو؟  
پھر کچھ وہ لوگ ہیں جو اُن آفتوں اور مصیبتوں کو رو رو کر سہتے ہیں، اور کچھ  
وہ لوگ ہیں جو اُن کا استقبال ہنس ہنس کر کرتے ہیں۔  
اقبال، غالب کے اس فلسفہ پر غافل تھے۔

رفتے زخم سے مطلب ہے لذتِ زخمِ سوزن کی  
سمجھتو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے؟  
وہ درد سے لطف لیتے تھے، مصیبتوں میں انہیں لذتِ ہلٹی تھی۔

فرماتے ہیں:-

نہ پوچھو مجھ سے لذتِ خانماں برباد رہنے کی  
گشیم سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

## سوز و الم

درد و سوز بھی اقبال کی شاعری کا ایک اہم حصہ ہے، وہ درد کی کہانی، اور سوز کا فسانہ سناتے ہیں، روتے ہیں، اور رلاتے ہیں، خود افسردہ ہوتے ہیں اور کجسین پر افسردگی طاری کر دیتے ہیں۔ لیکن اس درد و سوز کے بیان میں بھی الفاظ کی نراش خراش ترکیب کی چستی اور بندش کی جدت ایسی ہوتی ہے کہ پڑھنے والا معنی کے ساتھ لفظ پر غور کرنے اور سر دھننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں :-

اڑائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس، کچھ گل نے

چمن میں ہر طرف بکھری ہے داستان میری

اڑالی طوطیوں نے، ممتزئیوں نے، عندلیبوں نے

چمن والوں نے بل کر ٹوٹ لی طرزِ خاں میری

الہی پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا

حیات جاوداں میری نہ مرگ ناگہاں میری

---

”والدہ مرحومہ کی یاد میں“ — اس عنوان سے اقبال نے ایک طویل مثنوی کہا ہے

جو زبان و بیان کا ایک جتنا جاگتا مرقع، اور سوز و الم کی تصویر گویا ہے، چند بند انرا گیزی کے لحاظ سے خاص طور پر ممتاز ہیں درج کئے جاتے ہیں :-

آہ یہ دُنیا یہ ماتمِ حنائے بزمِ اوسپر  
 آدمی ہے کس طلسمِ دوش و سدا میں اسیر  
 کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت  
 گلشنِ بہشتی میں مانند نسیمِ اندازِ ہر موت  
 زلزلے ہیں بجلیاں ہیں، مخط ہیں آلام ہیں  
 کیسی کیسی دُخستِ رانِ مادرِ آیام ہیں  
 کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت  
 دشت و دریں، شہر میں گلشن میں، ویرانے میں موت  
 نے مجالِ شکوہ ہے نے طاقتِ گننا ہے  
 زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے

## جدتِ تشبیہ

تشبیہ اور استعارے سے تمام شعرا کام لیتے ہیں،  
 مطلب ہے ناز و غمزہ دے لے گفتگو میں کام  
 چلتا نہیں ہے دشمن و خنجر کہے بغیب

اقبال کی شاعری میں تشبیہ و استعارہ کی ایک دُنیا آباد ملتی ہے، لیکن اپنی عتیت

کے اعتبار سے بالکل نئی، بالکل عجیب، طرزِ نر،

”ہمالہ“ پر اقبال نے ایک نظم لکھی ہے، اور اس میں اپنی فکرِ فلک رسا کا عجیب

دلنیش نمونہ پیش کیا ہے ،

اس کی برف سے ڈھکی ہوئی بلند و بالا چوٹیوں کو دیکھ کر وہ کہتا ہے -

برف نے باندھی ہے ”دستارِ نفیلت“ تیرے سر

خندہ زن ہے جو کلاہ مہر عالماب پر

برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کو ”دستارِ نفیلت“ کے تشبیہ دینا کتنی اچھوتی بات

ہے ؟ فضا ئے آسمانی پر لکھ ہائے ابر کو اڑتے ہوئے ہم آپ سب دیکھتے ہیں ، ”بے زباں“

بھی ، اور ”زبانِ داناں“ بھی ، لیکن یہ منظر دیکھ کر اقبال کو کتنی نئی بات سوچتی ہے :-

ہائے کیا فطرطرب میں جھومتا جانا ہے ابر

”فیل بے زنجیر“ کی صورت اڑا جانا ہے ابر

”فیل بے زنجیر“ کی تشبیہ پر آپ نے غور کیا ؟

”ابر کو ہمارے کاترانہ اقبال کی زبان سے سنئے :-

دور سے دیدہ امید کو ترانا ہوں

کبھی بستی سے جو خاموش گزر جاتا ہوں

سیر کرتا ہوا جس دم لب جو آتا ہوں

بالیاں نہر کو گر داب کی پہناتا ہوں

سبز مزرعِ نوخیز کی امید ہوں میں

زاہِ بحر ہوں ، پروردہ خورشید ہوں میں

”گر داب“ کو بالی سے تشبیہ دینا کتنی نادر تشبیہ ہے -



ماند خامہ تیری زباں پر ہے حرفِ غیر  
بیگانہ شنے پہ نازش بیجا بھی چھوڑ دے

ایک طویل نظم کے چند شعرا۔  
آتی ہے ندی حبیبین کوہ سے گاتی ہوئی  
آسمان کے طائر وں کو لغتہ سکھلاتی ہوئی  
آئینہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسار حور  
گر کے دادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور  
لہر جھنکی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے  
یعنی اس فستار سے پانی کے تارے بن گئے  
جو مے سیماں رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی  
مضطرب بوندوں کی ایک دنیا نمایاں ہو گئی  
ہجرانِ فطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے  
دو قدم پر پھر وہی جو مثل تارِ سیم ہے

## طنز و تعریض

شاعرانہ طنز کی دلچسپ اور مہرِ لطف مثالیں بھی اقبال کے ہاں خوب ملتی ہیں، غلط  
اور نامح، زاہد اور محنت، شاعروں کے مخصوص موضوع ہیں، اقبال کے میخانہ میں بھی ان

کی پکڑی اچھلتی ہے، فرماتے ہیں۔

عجب وعظ کی دینداری ہے یارب  
عداوت ہے اُسے سارے جہاں سے  
بڑی رکیک ہیں وعظ کی چالیں  
لرز جاتا ہے آواز اذال سے

---

جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چین کے تو  
آہی نکلے گی کوئی بجلی جلاسنے کے لئے

---

موت کا نسخہ ابھی باقی ہے اسے درو فراق  
چارہ گردیوانہ ہے میں لا دو اکیونکر ہوا؟

---

امید خور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے وعظ کو  
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادھے بھول بھالے ہیں

---

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم  
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

---

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے نزلے اے دغظ  
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

واعظ کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد  
دُنیا جو چھوڑ دی تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

## حُسنِ تکلم

اقبال کی شاعری کا ایک اہم جزو ”حسن بیان“ بھی ہے، وہ جانی بوجھی حقیقتوں کو، روزمرہ کے واقعات کو، دیکھے ہوئے نظاروں کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اُس کا حسنِ بیان ایک نیا سماں اور نئی کیفیت پیدا کر دیتا ہے،  
”ابر کو بہار“ کے عنوان سے اُس نے ایک دلنشین نظم کہی ہے، کہتا ہے:-  
کبھی صحرا، کبھی گلزار ہے ممکن میرا

شہر و دیوانہ مرا بجز مرا، بن میرا  
کبھی وادی میں جو منظور ہو سونا محب کو  
سبزہ کوہ ہے محفل کا پچھونا محب کو

نظارے کو یہ جنبش مرگاں بھی یاد ہے  
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

جوانی ہے تو ذوق دید بھی لطفِ متنِ بھی  
ہمارے گھر کی آبادی قیامِ میہاں تک ہے

کس قدر اے مے تجھے رسمِ حجاب آئی پسند  
پردہ انگور سے نکلی تو میسناؤں میں تھی

اقبال کی نظارہ کشی کا ایک منظرِ لاطف ہو:-

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا مجھ کو نظر  
گوشہٴ دل میں چھپا کے اک جہانِ اضطراب  
شبِ سکوتِ انزا، ہوا سودہ، دریا نرم سیر  
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب  
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیرِ خوار  
موجِ مضطرب تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب  
رات کے انہوں سے طائرِ آشیانوں میں اسیر  
انجمِ کم منو گرفتارِ طلسمِ آفتاب

آوردِ آگے چل کر کہتے ہیں:-

اے رہینِ حسانہ تو لے وہ سماں دکھیا نہیں  
گو نجی ہے جب فصائے دشت میں بانگِ چیل

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام  
 وہ خضر بے برگ و سماں وہ سفر بے ننگ و میل  
 وہ نمودِ اختر سیاسِ پابنگامِ صبح  
 یا نمایاں بامِ گردوں سے جسین جبریل  
 وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب  
 جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں میں خلیلؑ  
 اور وہ پانی کے چٹے پر مقامِ کارواں  
 اہلِ ایمان جس طرح جنت میں گردِ سلبیل  
 پُختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جہاں زندگی  
 ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

## زبان و بیان

انبال کے کلام میں زبان و بیان کا لطف بھی بدرجہ اتم موجود ہے، الفاظ  
 یہ معلوم ہوتا ہے، انگشتی میں نگینہ جڑا ہوا ہے، ذرا ادھر سے ادھر کر دیکھے، تو اس  
 کی خوبی و رعنائی پر پانی پڑ جائے۔  
 گھٹا اٹھی، اور

جس میں حکمِ نشاطِ مدام لائی ہے  
 قبائے گل میں گہرائی کو لائی ہے

جو بچپول مہر کی گرمی سے سوچلے تھے اُٹھے  
 زمیں کی گود میں جو بچڑ کے سوہے تھے اُٹھے  
 ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا، اڑا بادل  
 اُٹھی وہ اور گھٹا، لو، برس پڑا بادل

---

”چاند“ کے عنوان سے ایک نظم کے چند شعرا۔  
 یہ داغ سا جو تیرے سینے میں ہے نایاں  
 عاشق ہے تو کس کا یا داغ آرزو ہے ؟  
 تو ڈھونڈتا ہے جس کو تاروں کی خاشی میں  
 پوشیدہ ہے وہ شاید غوغائے زندگی میں  
 استاد سرو میں ہے، سبزہ میں سورا ہے  
 بکبل میں نغمہ زن ہے، خاموش ہے کلی میں  
 آئیں تجھے دکھاؤں رخسار روشن اس کا  
 نہروں کے آئینہ میں شبِ نیم کی آرسی میں  
 صحرا و دشت و دریاں کہار میں وہی ہے  
 انساں کے دل میں تیرے رخسار میں وہی ہے

---

”بزمِ انجمن“ کے چند شعرا۔

سُورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو  
 طشت افق سے لیکر لالے کے پھول مارے  
 پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور  
 قدرت نے اپنے گبنے چاندی کے سب آٹاے  
 محل کی خاموشی کی لیلانے ظلمت آئی  
 چمکے عروس شب کے موتی وہ پیارے پیارے  
 وہ دور رہنے والے ہنگامہ جہاں سے  
 کہتا ہے جس کو ان اں اپنی زباں میں تارے

گلہ جفا سے وفا نہ کر مگر کمالِ حرم سے ہے  
 کسی بہت کدہ میں بیان کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

عشق کو فدا لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی  
 اب ذرا دل بھتا مگر فدا کی تاثیر دیکھ  
 تو نے دیکھا سطوت رفتار دریا کا عروج  
 موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب رنجیر دیکھ  
 عام حریت کا دیکھا تھا جو خوابِ اسلام نے  
 اے مسلمان آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں  
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

## تغزل

تغزل کارنگ بھی اقبال کے ہاں ملتا ہے، اور یہ رنگ بھی پھیکا نہیں چوکھا  
ہے۔ اقبال داغ کے شاگرد تھے، اُن کے تغزل میں بھی داغ کارنگ کہیں کہیں جھلکتا ہے  
اور اُن کی لہر ادیت بھی پوری شان سے موجود ہے، شعر سنئے :-

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں  
تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ

---

تو تھا اُن کو آنے میں متا صد  
مگر یہ بات طرزا نکار کیا تھی ؟

---

میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چپ بڑھتی  
کیا بنا دل میرا ان کا سا مٹا کیونکر ہوا ؟

---

میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن  
دیکھے مجھے کہ تج کو تماشا کرے کوئی ؟



چھپتی نہیں ہے یہ نگہ شوق ہم نشیں  
پھر اور کس طرح انہیں دیکھ کرے کوئی

---

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں  
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں  
ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا  
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں  
کوئی دم کا مہماں ہوں اسے اہل محفل  
چراغِ سحر میں بجھا چاہتا ہوں  
بھری بزم میں راز کی بات کہدی  
بٹا بے ادب ہوں سنا چاہتا ہوں

---

تجھے کیوں نہ کر ہے لے گلِ دل صد چاکِ بَیْل کی  
تو اپنے پیر بہن کے چاک تو پیلے رفو کر لے

---

خبرِ اقبال کی لائی ہے گلستاں نسیم  
نوگرفتار پھٹکتا ہے تہ دام ابھی

---

پھر بادِ بہار آئی اقبالِ غزلخواں ہو  
 غنچہ ہے اگر گل ہو، گل ہے نو گلستاں ہو

---







presented to  
Library  
of the  
City of Toronto  
by

High Commission

## شہر دل عزیز کتابیں

۵-۰	پاکستان میں ذہنی رجحانات	۸-۰	میمونہ رئیس احمد جعفری
۵-۰	عذر گناہ بدر شیکب	۲-۵۰	”
۳-۵۰	امننگ فخر الحسن	۴-۵۰	چیلنج قیسی رامپوری
۳-۵۰	تاحد نگاہ ضیا سرحدی	۴-۵۰	”
۳-۰	دکان شہشہ گر عبدالعزیز خالد	۲-۰	”
۱-۵۰	غزل الغزلات	۶-۰	کاٹی گھٹائیں احمد شجاع پاشا
۲-۰	سریلی بانسری آرزو لکھنوی	۲-۵۰	”
۲-۵۰	”	۲-۰	نسیم رشید اختر ندوی
۲-۰	عرش و فرش جوش ملیح آبادی	۳-۵۰	”
۳-۵۰	”	۳-۵۰	”
۳-۵۰	آیات و نعمات	۲-۵۰	”
۳-۰	”	۳-۰	”
۱-۲۵	”	۲-۰	”
۱-۰	”	۵-۰	”
۵-۰	”	۵-۰	”
۲-۵۰	”	۲-۰	”
۳-۰	”	۳-۰	”
۲-۰	”	۳-۰	”
۲-۰	”	۲-۵۰	”
۲-۰	”	۵-۰	”

بک لینڈ

۱۲ چھ بلیڈنگ بندر روڈ کراچی

فون ۲۶۱۰۹

P11  
2199  
I6Z67